نگارشات متعلق کارنامۂ حسینی

(۱) عزائے حسین علیہ السلام حقانیت اسلام کی پائدار یادگار

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

ایک مذہب کی سچائی کی بڑی علامت ہے اس مذہب کے بانیان کا ثبات قدم اور استقلال کے ساتھ مصائب کو برداشت کرنا اور باوجود اس کے آخر وقت تک اپنے اصول سے منحرف نہ ہونا۔

کسی مذہب کے عوام کا مصائب کو جھیلنا اور قربانیاں پیش کرنا زیادہ مستند امر نہیں ہے، اس لئے کہ عام افراد اکثر حقیقت حال سے بے خبر ہوتے ہیں۔ لہٰذا دھوکے میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ ان میں بہت ممکن ہے کہ وہ سراب کو آب اور مجاز کو حقیقت خیال کرلیں اور اپنے مزعوم باطل کی حمایت میں جان دینے پر بھی تیار ہو جائیں لیکن خود بانیٔ مذہب اور اس کے مخصوص گھر والے افراد کا جو اس کے اسرار زندگی اور معیار اخلاق و اوصاف سے پورے طور پر واقف ہیں اصول کی حمایت میں استقلال و ثبات قدم کے ساتھ مصائب کو برداشت کرنا اور ضرورت کے وقت جان کی قربانی پیش کرنا یہ بے شک اس کی دلیل ہوگا کہ اس اصول میں سچائی اور اخلاص کا جوہر مضمر ہے۔

یہی نکتہ نصارائے نجران کے پیش نظر تھا۔ جب وہ مباہلہ کے لئے تیار ہو کر آئے ہیں، تو ان کے بڑے اسقف نے کہا تھا کہ دیکھو اگر محمدؐ اپنے عزیزوں اور گھرانے والوں کو لے کر میدان مباہلہ میں آئیں تو کبھی مباہلہ نہ کرنا کیونکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ انہیں اپنی سچائی پر پورا بھروسہ ہے اور اس لئے وہ اتنے سخت موقع پر بھی اپنے عزیزوں اور دل کے ٹکڑوں کو علیحدہ نہیں کرتے اور اگر وہ اپنے ماننے والے اصحاب یعنی غیروں کو ساتھ لے کر آئیں تو مباہلہ کر لینا۔ اس سے ثابت ہوگا کہ وہ دوسروں کو اول دے کر اپنے خاص لوگوں کو بچانا چاہتے ہیں۔

اسی لئے جب حضرت اپنی پارۂ جگر فاطمہ زہراؑ اپنے ابن عم علیؑ بن ابی طالبؑ اور اپنے فرزندان حسنؑ اور حسینؑ کو لے کر آئے اور نصاریٰ کو معلوم ہوا تو انہوں نے مباہلہ سے گریز کیا۔ اور جزیہ دینے پر تیار ہو گئے۔

غزوات میں جناب رسالتمآبؐ کا عمل یہی تھا کہ آپ اپنے عزیزوں کو میدان جہاد میں سب سے آگے رکھتے تھے جس کا تذکرہ امیرالمومنینؑ نے نہج البلاغہ میں حسب ذیل الفاظ میں فرمایا ہے۔

وَكَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ إِذَا احْمَرَّ الْبَأْسُ وَأَحْجَمَ النَّاسُ قَدَّمَ أَهْلَ بَيْتِهِ فَوَقَى بِهِمْ أَصْحَابَهُ حَرَّ السُّيُوفِ فَقُتِلَ عُبَيْدَةُ وَالْأَسِيَّةِ بْنُ الْحَارِثِ يَوْمَ بَدْرٍ وَقُتِلَ حَمْزَةُ يَوْمَ أُحُدٍ وَقُتِلَ جَعْفَرٌ يَوْمَ مُؤْتَةَ۔ (مکتوب ۹، ص ۸۵)

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر اس موقع پر کہ جب خونریز صورت جنگ کی سامنے آتی تھی اور لوگوں کے قدم پیچھے ہٹتے تھے تو آپ اپنے گھر والوں کو آگے بڑھاتے تھے اور ان کو نیزہ و تیز کی آگ سے اپنے اصحابؓ کے بچاؤ کا ذریعہ بناتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب (حضرت کے چچا زاد بھائی) جنگ بدر میں جو سب سے پہلی اسلام کی لڑائی تھی قتل ہوئے۔ اور حمزہ بن عبدالمطلب (حضرت

کے چچا) احد میں مارے گئے۔ اور جعفرؑ بن ابی طالب جناب امیرؑ کے حقیقی اور رسولؐ کے چچا زاز بھائی موتہ کے دن شہید ہوئے۔

آخر میں ضرورت ہوئی ایک ایسے شہید کی جو کمال مظلومیت کا نمونہ ہو۔ اس کے لئے بھی آپؐ نے اپنے جگر کے ٹکڑے حسینؑ کو پیش کیا۔

یہ حسینؑ آپ کو کتنے عزیز تھے۔ وہ آپؐ کی ان احادیث سے ظاہر ہے کہ

حسین منی وانا من الحسین۔ احب الله من احب حسینا وابغض الله من ابغض حسینا ۔ الحسن و الحسین ریحانتائی الحسن والحسین سیدا شباب اهل الجنة وغیرہ وغیرہ

یہ سب اظہار محبت وفضیلت اسی لئے تھا کہ دیکھ یہ میرا کتنا پیارا بچہ ہے۔لیکن اگر حقیقت اسلام پر کوئی وقت پڑے تو میں اس کو بھی فدا کرنے پر تیار ہوں۔

یہ واقعہ کربلا کا وہ پہلو ہے جو مسلمانوں کے جوش عمل کے لئے انتہائی محرک ہے۔ اگر مسلمانوں کے دل میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہمارا اسلام وہ ہے جس کی قربانی میں رسولؐ کا پاک خون شامل ہے تو وہ ذوق عمل پیدا ہو جو ان کی کامیابی وکامرانی کا ضامن ہے۔

مظلومیت میں ایک خاص کشش اور افراد کی قوت عمل کے لئے محرکہ طاقت ہے جس کی وجہ سے وہ مذاہب جن میں ایسے افراد کی کمی ہے وہ کوشش کر کے اپنے لئے مظلوم تراشتے ہیں اور ان کے واقعات دردانگیز پیرایوں میں بیان کر کے دنیا کو ان کی مظلومیت سے متاثر کرتے ہیں۔

مثلاً حضرتِ مسیح کے متعلق مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ماقتلوہ وما صلبوہ۔ یعنی ان کو نہ قتل کیا گیا اور نہ سولی دی گئی۔ اس لئے کم از کم ہم تو یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ حضرت عیسیٰ پر ظلم وستم، سولی چڑھائے جانے اور قتل کئے جانے کے روایات تمام تر غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ لیکن باوجود اس کے عیسائیوں نے صرف دنیا کو حضرت عیسیٰؑ کی مظلومیت سے متاثر کرنے کے لئے ان کے واقعہ قتل کو اس درجہ اہمیت دی ہے۔ انجیل کے تمام نسخے متی ہو یا لوقا، مرقس ہو یا یوحنا سب میں آخری باب مسیح کی سولی پانے کے واقعات پر ضرور مشتمل ہے۔

صرف کتابوں میں درج کرنے پر ہی اکتفا نہیں ہوتی، بلکہ ان کے واقعہ قتل کی یادگار میں صلیب یعنی سولی کی تصویریں تیار کی گئی ہیں۔ اور وہ عیسائی عبادت خانوں میں آویزاں رہتی ہیں۔

مسیح کا آخری کھانا اپنے حوارین کی معیت میں جس کے متعلق بائبل میں ہے کہ یسوع مسیح نے روٹی لی اور برکت چاہ کر توڑی اور شاگردوں کو دے کر کہا کہ لو کھاؤ۔ یہ میرا بدن ہے پھر پیالہ لے کر شکر کیا اور انہیں دے کر کہا کہ تم بھی اس میں سے پی لو کیونکہ یہ عہدہ کا میرا وہ خون ہے جو بہتیروں کے کئے گناہوں کی معافی کے لئے پایا جاتا ہے۔ (متی باب ۲۶ فقرہ ۲۶، ۲۸ مرقس باب ۱۴ فقرہ ۲۲، ۲۴ لوقا باب ۲۲ فقرہ ۱۹، ۲۰)

اس واقعہ کی یادگار بالکل اسی صورت پر ہر سال منائی جاتی ہے اور گرجوں میں اسی طرح کھانا لا کر کہا جاتا ہے کہ یہ مسیح کا گوشت ہے۔ اور پانی لا کر کہا جاتا ہے کہ یہ مسیح کا خون ہے اور وہ کھایا پیا جاتا ہے۔ خود انجیل لوقا میں اس یادگار کو قائم رکھنے کی ہدایت بھی موجود ہے۔ چنانچہ اس میں ہے پھر اس نے روٹی لی اور شکر کر کے توڑی۔ اور یہ کہہ کر ان کو دی کہ یہ میرا بدن ہے جو تمہارے واسطے دیا جاتا ہے۔ میری یادگاری کے لئے یہی کیا کرو اور اسی طرح کھانے کے بعد پیالہ یہ کہہ کر دیا کہ یہ پیالہ میرے اس خون میں نیا عہد ہے جو تمہارے واسطے بہایا جاتا ہے۔

یہ کس لئے ہے؟ اسی لئے کہ مسیح کی مظلومیت سے ہمدردی حاصل کی جائے۔ حالانکہ مسیح کی مظلومیت باوجود ان خود ساختہ واقعات کے اس مظلومیت کی پاسنگ بھی نہیں ہے جو مظلوم کربلا حسینؑ بن علیؑ کی ذات سے مخصوص ہے۔ نہ مسیح کے یہاں خود اناجیل کے بیانات کی بنا پر وہ استقلال تھا جو حضرت امام حسینؑ

کے یہاں پایا جاتا ہے۔

پھر کیا یہ افسوس کا امر نہیں ہے کہ حضرت مسیحؑ کی مظلومیت کے لئے ان کے ماننے والوں کی طرف سے یادگاریں قائم کی جائیں۔اور یہ کوشش ہو کہ کسی وقت ان کی یاد دل سے محو نہ ہونے پائے لیکن جو حقیقی مظلوم ہو جس نے روحانیت کے راستے میں اپنے اور اپنے عزیزوں کا خون بہنا گوارا کیا ہو۔اس کی یادگار قائم کرنے میں مسلمانوں کے اندر اختلاف ہو۔اور بہت سے لوگ اس کی یادگار قائم رکھنا گوارا نہ رکھتے ہوں۔

یہ حقیقتاً مسلمانوں کی بدقسمتی ہے اگر وہ حقیقۃً اسلام سے ہمدردی رکھتے اور عقل و تدبر سے کام لیتے تو وہ متفق طور پر حسینؑ ابن علیؑ کا دامن ہاتھ میں تھامتے۔ان کی مظلومیت کو پیش کر کے دنیا کو اپنے مذہب کی روحانیت سے گرویدہ بنا لیتے۔

خدا کے لئے اس بحث کو چھوڑ دینا چاہئے کہ قاتلان حسینؑ شیعہ تھے یا سنی؟ یہ عجیب بات ہے کہ شیعوں کو کہا جائے کہ قاتلانِ حسینؑ شیعہ تھے تو شیعہ برا مانیں اور کہیں کہ وہ شیعہ نہیں سنی تھے۔سنیوں کو کہا جائے قاتلان حسینؑ سنی تھے تو سنی برافروختہ ہوں۔اور کہیں کہ نہیں وہ شیعہ تھے۔لیکن ان دونوں کا جو مشترک نتیجہ ہے اور وہ یہ کہ قاتلان حسینؑ مسلمان تھے، اس سے کوئی برا نہیں مانتا۔

آخر اگر شیعہ کہنے سے تشیع پر دھبا آتا ہے۔اس لئے شیعہ راضی نہیں ہوتے، سنی کہنے سے سنیت داغدار ہوتی ہے اس لئے سنی راضی نہیں ہوتے۔تو پھر مسلمان کہنے سے اسلام پر دھبہ کیوں نہیں آتا۔پھر مسلمان اس پر راضی کیوں ہوتے ہیں؟

یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ زبان سے کہنے کو چاہے شیعہ ہوں اور چاہے سنی اس کی فیصلہ کن تفصیل ہمارے رسالہ 'قاتلان حسینؑ کا مذہب' شائع کردہ امامیہ مشن میں ملاحظہ کی جائے لیکن حقیقۃً روح اسلام ان میں موجود نہ تھی۔اس لئے واقعاً وہ مسلمان ہی نہ تھے شیعہ اور سنی تو بعد کی بات ہے۔

اسلام حقیقت میں وہی تھا جس کے لئے حسینؑ نے اپنا خون بہایا اس لئے تمام مسلمانوں کو یکساں حیثیت سے ان کی قدر کرنا چاہئے۔

حسینؑ نہ صرف شیعوں کے حسینؑ ہیں نہ سنیوں کے حسینؑ ہیں حسینؑ اسلام کے حسینؑ ہیں۔تو تمام عالم انسانیت کو چاہئے کہ وہ حسینؑ کی شخصیت کو تمام اقوام عالم کے سامنے پیش کرے اور کہے کہ کوئی مذہب ایسا مظلوم پیش کر سکتا ہے جس نے اس طرح حق کے لئے قربانی پیش کی ہو؟

یہ واقعہ کربلا کا ایسا پہلو ہے جس کے لئے بیش از بیش اس کی یادگار قائم کرنے میں جدوجہد کی ضرورت ہے۔اور اس لئے مذہبی تعلیمات نے اس واقعہ پر نوحہ و ماتم، رنج و غم اور مظاہرہ حسرت و مصیبت کی تبلیغ کا انتہا درجہ انتظام کیا اور خود حضرت احدیت نے اس شہادت کے ہونے پر موجودات عالم میں تلاطم اور نظام سمٰوات و ارض میں اضطراب پیدا کر کے دنیا کو اس کی اہمیت کا احساس کرایا۔اور پیغمبرؐ اسلام حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے اسوۂ حسنہ کی مثال پیش کر کے اس مصیبت پر اظہار رنج و اندوہ کرنے کی تعلیم دی۔

حضرت رسولؐ خدا کی یہ متفق علیہ حدیث کہ **من رانی فقد رانی فان الشیطن لا تمثیل بصوتی**۔ جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے مجھ ہی کو دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت کے ساتھ ہمشکل نہیں ہوسکتا۔

یہ حدیث متعدد طریقوں سے صحاح ستہ میں درج ہے۔ اس روایت کی بنا پر وہ خواب جس میں حضرت رسولؐ اکرم کو دیکھا گیا ہو کسی طرح غیر مستند نہیں ہوسکتا اور پھر جب کہ اس خواب کا دیکھنے والا کوئی جلیل القدر رفیع المرتبہ روحانی و ربانی انسان ہو جیسے حَبر الامۃ ترجمان القرآن رئیس المفسرین عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ جن کے متعلق استیعاب۔اصابہ اور اسد الغابہ تمام مستند حالات اصحاب کی کتابوں میں مذکور ہے کہ **اترائ جبرئیل موتین و دعا لہ النبیؐ صوتین**۔ انھوں نے دو مرتبہ بچشم خود جبرئیل کا مشاہدہ کیا اور حضرت رسولؐ نے دو مرتبہ ان کے لئے

دعائے خیر کی جن کے متعلق رسولؐ نے دعا کی تھی۔ اللھم فقھۂ فی الدین وعلمہ الحکمہ ۔ خداوندا اسے دین میں فقیہ قرار دے اور اسے حکمت کی تعلیم عطا فرما۔

ایسے شخص کا خواب کوئی معمولی وزن نہیں رکھتا۔ انہوں نے روز عاشورا اسی دن جب امام حسینؑ شہید ہوئے ہیں، جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا اشعث اغیر قاروزۃٌ فیہا دم ملتقطۂ فسالہ فقال دم الحسین واصحابہ لم اقتبعہ منذم الیوم ۔ حضرت کے سر وریش مبارک کے بال پریشان ہیں۔ گرد وغبار پڑا ہوا ہے ۔ ہاتھ میں ایک شیشہ ہے جس میں خون بھرا ہوا ہے۔ ابن عباسؓ نے دریافت کیا فرمایا یہ حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کا خون ہے میں آج دن بھر اس کو جمع کرتا رہا ہوں۔

حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا خواب اسی دن جو حافظ ترمذی نے درج کیا ہے۔ رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم باکیا وبراسی لجنۃ التراب فسالۃ فقال الحسین افقا۔ انہوں نے رسالت مآبؐ کو دیکھا کہ حضرت رو رہے ہیں اور آپؐ کے سر وریش مبارک پر خاک ہے۔ ام سلمہؓ نے دریافت کیا تو فرمایا کہ ابھی ابھی حسینؑ قتل ہوئے ہیں۔

(صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ص ۱۱۸، ۱۱۹)

یہ رسالتمآبؐ کا عمل ہے جو دنیائے اسلام کے لئے نمونۂ اتباع ہے۔ یہ سب اسی غرض کے لئے تھا کہ مظلوم کی مظلومیت قائم رہے اور اس کی یاد سے وہی فائدہ اٹھایا جائے۔ جو اس کارنامہ سے وابستہ ہے۔

(ماخوذ از ہفتہ وار اخبار پیام اسلام لکھنؤ یکم جون ۱۹۶۴ء)

(۲) عشرۂ محرم اور مسلمانانِ پاکستان

مذکورۂ بالا سرخی سے ہفت روزہ ''لیل ونہار'' لاہور کی ۲۵ راگست کی اشاعت میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ ہم تو آپ کا نام دیکھ کر بہت ڈر گئے تھے اس لئے کہ آپ کے قلم کی حرارت آپ کی دو قرآن اور دو اسلام کتابوں میں اس شدت کے ساتھ ظاہر ہوئی ہے جس سے پوری امت اسلامیہ تلملا تلملا اٹھی ہے۔ نیز عبدالماجد صاحب دریا آبادی کے نام آپ نے جو گرم گرم خطوط لکھے ہیں ان کے شعلے ''صدق جدید'' کے صفحات پر نظر آتے ہیں، مگر ان تمام اندیشوں کے خلاف آپ کا یہ مضمون کافی سکون اور سنجیدگی کا حامل ہے اور اسی لئے اس کے مندرجات اس کے مستحق معلوم ہوتے ہیں کہ ان پر سنجیدگی کے ساتھ نظر ڈالی جائے۔ شروع میں جناب برقؔ نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

''سانحہ کربلا میں چند حقائق پر مسلمان متفق ہیں کہ

۱۔ حضرت امام حسینؑ حضور پرنور صلعم کے نواسے تھے۔

۲۔ ان کا کردار نہایت بلند اور مقاصد نہایت عظیم تھے۔

۳۔ انہوں نے اللہ کی راہ میں تاریخ انسانیت کی سب سے بڑی قربانی پیش کی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ نے تعمیل امر اللہ میں صرف حضرت اسمٰعیلؑ کو پیش کیا تھا۔ خود ابوالملت آتش نمرود میں اکیلے کود ے تھے۔ حضرت مسیح دار ورسن کی طرف یکہ وتنہا چڑھے تھے لیکن حضرت امام حسینؑ نے کربلا میں سارے خاندان کی قربانی پیش کی تھی۔

۴۔ یزید بدکردار اور ظالم تھا۔

۵۔ جب حق کے بالمقابل صف آرا ہو جائے تو باطل کا سر قلم کر دینا یا اپنا سر دے دینا ہی منشائے ایزدی کی تکمیل ہے۔''

مذکورہ بالا باتوں کو تمام مسلمانوں کے متفقہ فیصلہ کی حیثیت سے درج کرنا یہ ثابت کر دینے کے لئے کافی ہے کہ جناب برقؔ صاحب خدانخواستہ بابائے اردو عبدالحق صاحب یا محمود احمد عباسی کے ہم خیالوں میں نہیں ہیں جو کہ مذکورہ باتوں میں سے سوا ایک ایک پہلی چیز حضرت امام حسینؑ حضور پرنور کے نواسے تھے اور کسی بات کو بھی غالباً تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔

اب جناب برقؔ کے ان امور کو بطور مسلمات قبل میں درج

کر دینے سے یہ آسانی ہوگئی کہ موصوف سے بحث و گفتگو میں امور مذکورہ کو اصول موضوعہ کی حیثیت دی جاسکتی ہے جن پر بحث کا دارومدار ہوا کرتا ہے۔

مذکورہ بالا مسلمات کو درج کرنے کے بعد جناب برقؔ نے ایک ''لیکن'' کے ساتھ جو کروٹ بدلی ہے وہ حسب ذیل ہے:۔ آپ فرماتے ہیں۔

''لیکن ہماری تاریخ کے اس بے مثال اور قابل صد افتخار واقعہ کو کچھ اس بے سلیقگی سے منایا جاتا ہے کہ فرقہ پرستی کے وطن سوز شعلے بستی بستی بھڑک اٹھتے ہیں۔ قیام امن کے لئے پولیس طلب کی جاتی ہے۔ حکومت دس دن تک خوف سے کانپتی رہتی ہے۔ کہیں ٹیر گیس استعمال ہوتی ہے تو کہیں مجبوراً گولی چلانا پڑتی ہے۔ جب یہ عشرہ گذر جاتا ہے تو فضا میں تلخیاں ہی تلخیاں باقی رہ جاتی ہیں اور لاکھوں دلوں میں بغض و منافرت کی دھیمی دھیمی آگ مہینوں سلگتی رہتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سید الشہداؑء کے اس ذبح عظیم کا مقصد یہی تھا کہ ان کے جدامجد کے پیرو ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے اور انتشار و منافرت کی چنگاریوں کو ہوا دیتے رہیں۔ اگر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور اعمال نتائج سے پرکھے جاتے ہیں، اگر تقریب محرم کا نتیجہ منافرت کے سوا اور کچھ نہیں تو پھر میرے خیال میں اس کا نہ منانا ہی بہتر ہے۔''

شکر یہ صد شکر یہ کہ جناب برقؔ صاحب نے اصل مقصد کے بتانے میں زیادہ انتظار کی زحمت نہیں دی بلکہ جلد ہی صاف صاف کہہ دیا کہ ''مطلب سعدی'' کیا ہے۔

جواباً گذارش ہے کہ محرم فقط قلمرو پاکستان ہی میں تو منایا نہیں جاتا بلکہ اس کے بالکل پاس ہندوستان میں بھی صدیوں سے منایا جاتا ہے جہاں غیر مسلم اکثریت برسر اقتدار ہے۔ ایران میں بھی منایا جاتا ہے جہاں برسر اقتدار حکومت شیعہ ہے اور عراق میں بھی جہاں برسر اقتدار سنی ہیں بلکہ دنیا میں ہر جگہ جہاں شیعہ آباد ہیں۔ آخر پاکستان کے علاوہ کہیں بھی عشرہ محرم ان نتائج کا حامل کیوں نہیں ہوتا۔ جن کی نشاندہی اس مضمون میں کی گئی ہے۔ کہیں فرقہ پرستی کے وطن سوز شعلے نہیں بھڑکتے۔ کہیں قیام امن کے لئے پولیس طلب نہیں کی جاتی، کہیں حکومت دس دن تک خوف سے نہیں کانپتی، کہیں ٹیر گیس استعمال نہیں ہوتی، کہیں گولی نہیں چلانا پڑتی، کہیں عشرے کے بعد تلخیاں ہی تلخیاں باقی نہیں رہتیں۔ بلکہ ہندوستان میں مشاہدہ تو یہ ہے کہ پرچم حسینی کے نیچے وہ عناصر بھی یکجا ہوجاتے ہیں جو باہم ہر حیثیت سے مختلف ہیں اور آپس میں انتہائی منافرت رکھتے ہیں۔ حسینی مجلسوں اور جلوسوں میں ہندو، عیسائی، پارسی اور سکھ سب مسلمانوں کے دوش بدوش شریک ہوتے ہیں اور کانگریسی، سوشلسٹ اور کمیونسٹ تک کا امتیاز اٹھ جاتا ہے۔ مگر پاکستان میں جس کے قیام کو ابھی قلیل ہی مدت ہوئی ہے بقول جناب برقؔ صاحب ''عشرہ محرم میں فرقہ پرستی کے وطن سوز شعلے بستی بستی بھڑک اٹھتے ہیں۔ قیام امن کے لئے پولیس طلب کی جاتی ہے۔ حکومت دس دن تک خوف سے کانپتی رہتی ہے۔ کہیں ٹیر گیس استعمال ہوتی ہے اور کہیں مجبوراً گولی چلانا پڑتی ہے۔ اور جب یہ عشرہ گذر جاتا ہے تو فضا میں تلخیاں ہی تلخیاں رہ جاتی ہیں۔'' ظاہر ہے کہ عشرۂ محرم کی عزاداری کا درخت تو تمام دنیا میں ایک ہی ہے اور اس کے پھل وہی سمجھے جاسکتے ہیں جو سب جگہ یکساں طور پر نظر آئیں۔

اب اگر یہ نتائج صرف پاکستان میں نظر آتے ہیں اور یہ صحیح ہے کہ ''درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے'' تو یہ سمجھنا ناگزیر ہے کہ پاکستان کی اکثریت کچھ ایسے جذبات اور تصورات کی حامل ہے کہ وہ اقلیت کے ان بے ضرر مراسم کو جو وہ عزائے مظلوم کے سلسلہ میں انجام دیتے ہیں برداشت نہیں کرتی۔ یہ وہی جماعت ہے جو ہندوستان میں بھی قبل تقسیم عزاداری کے خلاف ''شرک اور بدعت'' کے نعرے لگا کر طرح طرح کے فتنہ سامانیاں کیا کرتی تھی مگر اس وقت وہ ایک تیسری طاقت کے برسر اقتدار ہونے کی وجہ سے بے بس تھی، اب پاکستان کے قیام کے

بعد وہ ''اموی اور عباسی'' اقتدار اور اس کے کارناموں کے تازہ کرنے کے خواب دیکھ رہی ہے اور اس لئے بجبر وتشدد اقلیت کو اس کے حقوق مذہبی سے محروم کرنا چاہتی ہے۔

اس صورت میں یہ نتیجہ نکالنا کہ ''عزاداری کا ترک کردینا ہی بہتر ہے۔'' ایسا ہے جیسے بھارت کے کوئی مہا سبھائی مہاشے اس طرح گل افشانی فرمائیں کہ ہندوستان میں مسلمان جو بقرعید مناتے ہیں وہ اس بے سلیقگی سے منائی جاتی ہے کہ فرقہ پرستی کے وطن سوز شعلے بستی بستی بھڑک اٹھتے ہیں قیام امن کے لئے کہیں پولیس طلب کی جاتی ہے۔ حکومت بقرعید کے چار پانچ دن پہلے ہی سے اور اس کے چار پانچ دن بعد تک یعنی تقریباً دس دن تک خوف سے کانپتی رہتی ہے۔ اور پھر اس کی تان اس پر ٹوٹے کہ چونکہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور اعمال نتائج سے پرکھے جاتے ہیں اگر تقریب بقرعید کا نتیجہ منافرت کے سوا اور کچھ نہیں تو پھر میرے خیال میں اس کا نہ منانا ہی بہتر ہے۔''

ظاہر ہے کہ ''میرے خیال میں'' صرف اپنے اکثریتی جذبات کا ایک نرم طریقہ اظہار ہی ہوگا۔ اسے کوئی منصفانہ حل مسئلہ کا نہیں سمجھا جاسکتا، جسے ان کی قوم کے دوسرے آدمی ڈنڈے کے زور سے منوانا چاہتے ہیں اسی کو وہ ذرا ''مسکینی'' کے لہجہ میں کہہ رہے ہیں، بات وہی ہے کہ اقلیت کو اپنا حق ترک کردینا چاہئے اور اکثریت کی خاطر اپنے جذبات مذہبی کی قربانی کردینا چاہئے۔ وہی جناب برقؔ کے ارشاد کی نوعیت ہے ورنہ ایسی صورت میں عدل وانصاف کا تقاضا کیا یہ ہوتا ہے جیسا جناب برقؔ صاحب نے تجویز کیا ہے کہ محرم کا نہ منانا ہی بہتر ہے۔'' یا یہ کہ برقؔ صاحب ایسے مفکرین اکثریت کی ذہنیت میں تبدیلی کی کوشش کریں اور حکومت اپنی طاقت سے اکثریت کی چیرہ دستیوں کا سد باب کرے تاکہ سید الشہداءؑ کی یادگار پاکستان میں بھی اسی امن وسکون کے ساتھ قائم ہوتی رہے جس طرح وہ تمام دنیا میں قائم ہوتی رہتی ہے۔

جناب برقؔ صاحب نے عشرۂ محرم میں مسلمانوں کے باہمی مناقشہ کا سرچشمہ طرفین کے علماء کو قرار دیتے ہوئے ارشاد کیا ہے کہ:۔

''ایک طرف اہل سنت کے علماء تردید شیعیت میں فصاحت کے دریا بہاتے ہیں اور دوسری طرف شیعی واعظین سارا عشرہ اس بات کو ثابت کرنے میں صرف کردیتے ہیں کہ:

۱۔ اہل بیت مظلوم تھے اور ظالموں میں فاروق وصدیق بھی شامل تھے۔

۲۔ رحلت حضور صلعم کے بعد خلافت کے مستحق صرف حضرت علیؑ تھے۔

۳۔ حضرت فاروق اور صدیق نے اہل بیت کو باغ فدک سے محروم کردیا تھا۔ (''ہفت روزہ لیل ونہار'' لاہور ۲۵ ؍اگست)

اس میں بظاہر تو جناب برقؔ صاحب نے بڑی انصاف پسندی سے کام لیتے ہوئے سنی اور شیعہ دونوں طرف کے علماء کو ذمہ دار قرار دیا ہے مگر انہوں نے دونوں طرف کے کردار کا جو خاکہ پیش کیا ہے اس میں ادھر کے جرم کو ہلکا اور ادھر کے جرم کو سنگین کرکے توازن کو ختم کردیا ہے۔

اہل سنت کے علماء کا جرم تو یہ لکھا ہے کہ ''وہ تردید شیعیت میں فصاحت کے دریا بہاتے ہیں مگر اس فصاحت کی تفصیل نہیں لکھی ہے کہ وہ فصیحانہ ارشادات کیا کیا ہوتے ہیں بلکہ ردشیعیت سے ایک شخص کے ذہن میں یہ تصور ہوسکتا ہے کہ وہ صرف علمی اور استدلالی انداز سے شیعیت کے ابطال میں فصیح تقریریں فرماتے ہیں اور شیعہ اتنے سرپھرے ہیں کہ اس پر لڑنے مرنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ وہ عشرۂ محرم میں اسی عزاداری اور یادگار حسینیت کے خلاف جو شیعوں کی حیات ملی کی شہرگ ہے، پوری طاقت سے مورچہ قائم کرتے ہیں، اشتہارات شائع کرتے ہیں۔ رسالے تقسیم کرتے ہیں، تقریریں کرتے ہیں، جس میں اس کو شرک و بدعت بتایا ہی نہیں جاتا بلکہ شیعوں کے افعال واعمال کا مذاق بھی اڑایا جاتا ہے۔ ان کے اخلاق وکردار پر شرمناک بہتان

بھی لگائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ علانیہ شیعوں کو کافر و مشرک کہا جاتا ہے۔ ان کے ایمان بالقرآن کی نفی کی جاتی ہے۔ تقیہ کو جھوٹ اور متعہ کو زناکاری کے نام سے موسوم کرکے حقیقی شریعت اسلامیہ کے قوانین کی توہین کی جاتی ہے اور وہ بھی سوقیانہ لب ولہجہ میں اور اس سے بڑھ کر کہ جہاں بھی موقع ملتا ہے حکام سے کہہ سن کر عزاداری پر پابندیاں لگوائی جاتی ہیں اور جہاں بھی اپنے میں بل بوتا محسوس ہوتا ہے وہاں مسلح ہوکر بزور طاقت روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں خوں ریزی ہی نہیں بلکہ کسی وحشیانہ و بہیمانہ کردار سے بھی گریز نہیں کرتے اسی طرح وہ سورما جو ہندوستان میں تعزیہ کے احترام کے لئے پیپل کی شاخ کاٹنے پر انتہائی اصرار کرتے ہوئے ہندوؤں کے مقابلہ میں برسر پیکار ہوجاتے تھے، وہی تعزیہ داری کو روکنے کے لئے شیعوں کے مقابلہ میں برسر جنگ ہوتے ہیں اور موقع آنے پر خود توہین تعزیہ میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔

دوسری طرف شیعوں کے مجالس کا جو خاکہ دکھایا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیعوں کے یہاں مجالس میں واعظین کا بیان بس اہل سنت کے صدیق وفاروق کو برا کہنے اور فدک اور خلافت کے قصوں میں محدود ہوتا ہے حالانکہ جس شخص نے دو ایک دفعہ نہیں کہ اتفاقاً یا یوں کہا جائے کہ قسمت سے اسے یہی سننے میں آگیا ہو بلکہ بالاستمرار مجالس میں شرکت کی اور تنوع کے ساتھ مختلف بیانات کو سنا ہو وہ اس کی تصدیق نہیں کرسکتا۔

شیعوں کے مجالس کا محوری نقطہ تو مصائب امام حسینؑ کا بیان ہوتا ہے چنانچہ ایک زمانہ میں تو مجالس کے بیانات اکثر منحصر تھے صرف واقعات کربلا کے دردناک انداز میں بیان پر۔ ان میں اس واقعہ کے اسباب وعلل پر کوئی تبصرہ ہی نہیں ہوتا تھا تو بات پچاس برس پہلے کے واقعات یعنی فدک اور خلافت تک پہنچنے کی نوبت کہاں آسکتی تھی۔ اس کے بعد ذاکری کے ارتقا کا وہ دور آیا جب صاحبان علم نے مصائب کی تمہید میں مضامین و مطالب علمیہ کے بیان کو نصب العین قرار دیا تو اس کے بعد ترقی کے مختلف درجوں کے ساتھ مجالس حسینی کا منبر اپنے سامعین کے لئے ایک ایسا مدرسہ بن گیا جس میں توحید سے لے کر معاد تک علم کلام کے ہر گوشہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اثبات وجود باری اس منبر پر ہوتا ہے۔ فلسفہ رسالت اس منبر پر بیان ہوتا ہے۔ شان رسول اس منبر پر واضح کی جاتی ہے۔ مختلف انبیاء ومرسلینؑ کے واقعات وحالات اس منبر سے گوش گذار کئے جاتے ہیں۔ پھر حضرت رسول اکرمؐ کے اخلاق و اوصاف، آپ کی سیرت بلند، آپ کے غزوات آپ کی معراج، آپ کی ذات مطہرہ اور سیرت حیات پر غیر مسلموں کی طرف سے جو اعتراضات ہوتے ہیں ان کے جوابات یہ سب اسی منبر سے ہوتا ہے۔ حیات بعد الموت برزخ سب کا تذکرہ اسی منبر پر ہوتا ہے۔ عملی دنیا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام اسی منبر سے کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض محتاط شیعہ علماء کی نگاہ میں قابل اعتراض ہونے کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی تنظیم وتربیت کا کام تک اسی منبر سے انجام دیا گیا ہے۔ اس سب کے ساتھ بلا شبہ کبھی مستقلاً اور کبھی ضمناً مسئلہ خلافت یا قضیہ فدک وغیرہ بھی زیر بحث آتا ہے۔ مگر اس کی بنا پر یہ تو کہنا درست نہیں ہے کہ ان مجالس میں واعظین بس اسی کو بیان کرتے ہیں۔ یہ شیعوں کی مجالس سے ناواقفیت ہے یا بہتان طرازی۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ شیعہ علماء کے منبری بیانات مجالس کے بہت سے مجموعے کتابی صورت میں موجود ہیں۔ جیسے نجف اشرف کے مشہور عالم اور واعظ علامہ شیخ جعفر شوستری کی کتاب **مجالس المواعظ و البكاء** اور **فوائد المشاهد**۔ پنجاب میں علامہ شیخ عبدالعلی ہروی کی کتاب مواعظ حسنہ۔ لکھنؤ میں جناب بحرالعلوم الن صاحب قبلہ کی بناء الاسلام۔ خطیب آل محمد مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ کی ''معراج الکلام'' اور ادارہ ''مرکز اصلاح'' کی کتابیں ان کو دیکھا جائے کہ کیا ان میں وہی سب کچھ ہے جو جناب برق صاحب نے لکھا ہے۔ یا اس کے علاوہ اور بہت کچھ ہے؟

ہاں جس طرح علوم وفنون میں آج کل ''تخصص'' کا ایک نظام ہے۔اسی طرح شیعہ واعظین میں یہ ہوتا ہے کہ بعض افراد کسی خاص شعبہ کے بیان میں مہارت خاص کے مالک ہوتے ہیں اور مشہور ہوتے ہیں جیسے حکیم مرتضیٰ حسین صاحب الہ آبادی مرحوم کہ توحید اور معراج کے بیان میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ موجودہ دور میں جناب عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ کی پردہ کے متعلق تقریر خاص شہرت رکھتی ہے۔اسی طرح بعض واعظین، مسئلہ خلافت یا عموماً مناظرانہ مضامین خوب کرتے ہیں اور اسی صفت کے ساتھ مشہور ہوجاتے ہیں اور چوں کہ لوگ ان کی زبان سے اسی کے مشتاق ہوتے ہیں لہٰذا وہ اسی کو زیادہ تر بیان بھی کرتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ وہ طبقہ واعظین میں سے صرف بعض افراد ہوتے ہیں۔ان کے بیانات سے بھی یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جاسکتا کہ شیعوں کی مجلسوں میں بس یہی چیزیں بیان ہوتی ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شیعوں کی مجلسیں مدرسہ الٰہیات، مدرسہ اخلاقیات، مدرسہ اجتماعیات اور مدرسہ تاریخ ہیں جن کی وجہ سے اکثر شیعہ بچوں کو مذہبی اور تاریخی مسائل اتنے معلوم بلکہ محفوظ ہوجاتے ہیں جتنے دوسرے مذاہب کے بڑے بڑے سن رسیدہ افراد کو بھی نہیں ہوتے۔یہ صرف مجالس حسینی کا فیض ہوتا ہے جو بالکل نمایاں ہے۔

جناب ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب برقؔ نے شیعہ اور سنی کشمکش کے سلسلہ میں ''امن وصلح کی اپیل کے طور پر حسب ذیل ارشاد کیا ہے:۔

میں علماء اہل سنت سے مودبانہ پوچھتا ہوں کہ آپ نے گذشتہ تیرہ سو برسوں میں کتنے شیعوں کو اپنے مواعظ سے ہم خیال بنایا؟ شاید ایک بھی نہیں۔دوسری طرف آپ کے مواعظ سے گذشتہ تیرہ صدیوں میں بے اندازہ خوں ریزی ہوئی۔ہماری تاریخ کا ہر ورق ان گنت بے گناہ عوام کے لہو سے رنگین ہے۔ آپ کی اشتعال انگیز تقاریر سے بھڑک کر آتش وخون کی کھولتی ہوئی ندی میں کود پڑے تھے۔باقی لاتعداد واقعات کو چھوڑیئے، صرف ایک واقعہ یاد کیجئے کہ ایران کا ایک فرماں روا اسمٰعیل صفوی ۱۵۰۴ء۔۱۵۲۴ء شیعہ تھا اور سلطنت عثمانیہ کا حکمران (سلیم اول) ۱۵۱۴ء۔۱۵۴۰ء سنی۔دونوں اپنے اپنے علماء کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔پہلے دلوں میں کینہ وبغض پیدا ہوا۔ پھر ایک دوسرے کو دشنام آلود خطوط لکھے گئے اور بالآخر ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑ گئی۔اسمٰعیل کی افواج کو شکست ہوئی۔اور سلیم نے تبریز میں داخل ہوکر پہلے عوام کو تہ تیغ کیا اور ستر ہزار سروں کا ایک مینار تیار کرایا۔

اگر شیعہ وسنی تصادم کے تمام واقعات یکجا کئے جائیں تو شاید کئی جلدوں میں بھی نہ سمائیں۔میں سنی علماء سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ ان ہی الم ناک واقعات کا پھر اعادہ چاہتے ہیں؟ اور شیعی علماء سے پوچھتا ہوں کہ آپ باغ فدک اور خلافت کی بحث کو آج چودہ سو برس بعد چھیڑ کر اور فاروق وصدیق کو غاصب وظالم ثابت کرکے کون سا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ ٹھوس تاریخی شہادتوں سے یہ ثابت بھی کردیں کہ باغ فدک اور مسند خلافت کے مستحق اہل بیت تھے تو اس کا عملی فائدہ کیا ہوگا؟ کیا یہ باغ اہل بیتؑ کو اب مل جائے گا؟ کیا حضرت علیؑ کو حضرت صدیق کی جگہ مسند خلافت آج بٹھایا جائے گا؟ اگر یہ نتائج ناممکن الحصول ہیں تو ان ناگوار مسائل کو چھیڑنے مطلب؟۔

(ہفت روزہ لیل ونہار لاہور ۱۵ر اگست ۱۹۵۷ء)

جہاں تک شیعہ سنی اتحاد کا سوال ہے اس کی اہمیت و ضرورت سے کسی صاحب عقل وشعور کو انکار نہیں ہوسکتا اور اس لئے کسی فریق کے لئے بھی اشتعال انگیزی اور مفسدہ پروری ہرگز جائز نہیں ہوسکتی مگر اس اتحاد کی یہ شکل درست نہیں ہوسکتی کہ کسی فریق کو مختلف فیہ مسائل یا مختلف فیہ شخصیتوں کے بارے میں اپنے خیالات کے اظہار کا حق ہی نہ دیا جائے جیسا رجحان مذکورہ بالا عبارت کے آخری حصہ میں ظاہر کیا گیا ہے۔اس سے تو اقلیت کو یہ احساس پیدا ہورہا ہے کہ ہم سے ہماری آزادی تقریر وتحریر کو سلب کیا جارہا ہے۔یہ تو اور زیادہ بے اطمینانی کا موجب ہے

اور بے اطمینانی بڑھتے بڑھتے بدامنی تک منجر ہوتی ہے۔

شیعی احساسات کے لحاظ سے یہ کہنا بالکل عجیب منطق کی حیثیت رکھتا ہے کہ اب ان باتوں کے بیان سے فائدہ کیا؟ مثال کے طور پر کسی کا گھر لٹ جائے، وہ کسی وقت دردمندانہ انداز میں اس کا ذکر کر رہا ہو۔ آپ کہیئے اب اس کے ذکر سے فائدہ کیا وہ سامان مل تھوڑی جائے گا۔

اس سے زیادہ یہ کہ کسی کا کوئی عزیز بھائی یا بیٹا مر گیا ہو وہ رو رو کر اس کا ذکر کر رہا ہو اور آپ کہیئے کہ اس سے کیا فائدہ اب وہ دوبارہ زندہ تھوڑی ہو سکتا ہے۔

اس اصول کی رو سے تو قرآن مجید پر بھی اعتراض وارد ہوگا کہ اس نے گذشتہ انبیاء و مرسلینؑ کے واقعات کیوں بیان کئے اور ان مظالم کا جو ان کی قوم نے ان کے ساتھ کئے کس لئے تذکرہ کیا۔ آخر ابراہیمؑ اور نمرود کے قصہ کے بیان سے کیا فائدہ؟ کیا اب نمرود مسلمان ہو جائے گا اور جناب ابراہیمؑ کی ایذا رسانی سے باز آجائے گا؟

بنی اسرائیل کے وہ تمام بچے جو فرعون نے قتل کرا دیئے اب دوبارہ زندہ تو نہیں ہو جائیں گے۔ پھر آخر قرآن مجید میں اس تذکرہ کا حاصل ہی کیا ہے اور اس سب کے پہلے ابلیس نے جو آدمؑ کے سجدہ سے انکار کیا تو بہرحال جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب نہ آدمؑ پھر پیدا ہوں گے اور نہ ابلیس انہیں سجدہ کرے گا۔ پھر اب بار بار کے ذکر سے فائدہ ہی کیا ہے؟

اگر اس عجیب و غریب منطق سے کام لیا جائے تو ہم سنی بھائیوں سے بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ شیعہ فدک کے مسئلہ پر خواہ مخواہ بحث کرتے ہیں تو اس سے آپ کے خلفاء کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچ سکتا۔ اب یہ تو ہونے کا نہیں کہ فدک ان سے چھین کر اہل بیت کو دے دیا جائے ۔ پھر آپ کو اس پر تکلیف محسوس کرنے کی ضرورت کیا ہے؟

اور اگر یہ لوگ ثابت کرتے ہیں کہ آپ کے تینوں خلفاء حق پر نہ تھے تو اب بہرحال اس سے یہ خطرہ نہیں ہے کہ وہ خلفاء تخت خلافت سے ہٹ جائیں اور وہ تخت حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو مل جائے۔ پھر اس میں آپ کا کیا حرج ہے اور آپ اس پر کیوں خفا ہوتے ہیں؟

ظاہر ہے کہ یہ ہماری منطق کسی سنی کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ جن کے ساتھ وہ اپنی عقیدت وابستہ کئے ہوئے ہے انہیں برا کہنا یقیناً اس کے لئے تکلیف دہ ہونا چاہئے تو پھر اپنے پیشواؤں پر لفظی طور سے کسی حملہ سے اگر آپ تکلیف محسوس کرتے ہیں تو شیعہ جماعت کے روحانی پیشواؤں کو ان کے علم ویقین میں جنہوں نے لفظی نہیں بلکہ ہر طرح کی روحانی اور جسمانی ایذائیں پہنچائیں ان سے وہ کیوں کر تکلیف محسوس نہ کریں گے اور اس تکلیف کا اظہار موقع پڑنے پر ان کی تقریر و تحریر میں کس طرح نہ ہوگا؟ اس کے مقابلہ میں یہ منطق کہ اب اس سے کیا فائدہ؟ کیوں کر قابل قبول ہو سکتی ہے۔

ہاں عقلی طور پر دونوں فریق سے یہ مطالبہ حق بجانب ہو سکتا ہے اور یہی وہ فیصلہ ہے جو غیر جانب دار حکومتوں نے ہندوستان میں کیا اور اب بھی وہی قائم ہے کہ نہ سنی اپنے جذبات کو سنی رہتے ہوئے ترک کر سکتے ہیں اور نہ شیعہ اپنے جذبات کو دل سے نکال سکتے ہیں مگر رہنا دونوں کو ایک ہی ملک میں ہے لہٰذا نہ یہ منظر عام پر ان کے پیشوایان مذہب کو علانیہ برا کہیں اور نہ وہ منظر عام پر ان افراد کی جو ان کے نزدیک ان کے پیشوایان دین پر ظلم ڈھانے والے ہیں مدح کریں۔

یہی وہ عملی سمجھوتہ ہے جو ہر متمدن ملک میں باہمی طور پر یا حکومت کے اثر سے ہونا قرین عدل وانصاف ہے۔

برقؔ صاحب کے اب تک کے وعظ ونصیحت کا مطلب تو یہ نکل رہا تھا کہ یہ چودہ سو برس ادھر کی باتیں ہیں۔ اب ان بحثوں میں پڑنے سے فائدہ ہی کیا ہے۔ مگر آخر میں وہ خود اس اصول کے پابند نہیں رہے اور اس چودہ سو برس پہلے والی بحث کے میدان میں اتر ہی پڑے اس طرح کہ ارشاد ہوتا ہے:۔

اگر ہمارے علماء تاریخ پر محققانہ نظر ڈالیں تو یہ حقیقت

واضح ہوکر سامنے آجائے گی کہ ہماری مذہبی تاریخ میں جعلی روایات موجود ہیں۔ جنگ صفین کے بعد خوارج کا سلسلہ چل پڑا جن کے کئی فرقے بن گئے مثلاً اباضیہ، صیفریہ، عجاردہ وغیرہ۔ خود شیعوں اور سنیوں میں کئی فرقے پیدا ہوگئے۔ ادھر فرقہ کے رہنماؤں نے کمال یہ کیا کہ اپنے افکار وعقائد کی تائید میں بہ کثرت احادیث وضع کرلیں۔ آج ایسی احادیث کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے جن کے ایک حصہ پر سنیوں کا قبضہ ہے اور دوسرے پر شیعوں کا۔ ہر ہر فرقہ اپنے احادیث کی سچائی پر دھواں دھار تقریریں کررہا ہے۔ ان روایات کی بنا پر ایک دوسرے کے گلے کاٹنا، اسلاف پر کیچڑ اچھالنا، اپنی تقریروں میں نیش ونشتر بھرنا اور جذبات منافرت سے سارے ماحول کو مسموم بنانا کہاں تک درست ہے؟ سیکڑوں اہم کتب تاریخ میں یہ بھی تو لکھا ہے کہ حضرت علی وصدیق وفاروق رضی اللہ عنہم کے باہمی تعلقات مہرو ولانہایت عمیق واستوار تھے۔ ان روایات کو غلط سمجھ کر صرف ایسی روایات کو صحیح سمجھنا جو ان میں بغض وعداوت ثابت کرتی ہوں، کون سی مذہبی واخلاقی الجھن کا حل اور کس سیاسی وتمدنی مرض کا علاج ہے؟ جب حقیقت آفتاب سے بھی زیادہ واضح ہوچکی ہے کہ تمام اسلامی فرقوں کے ہاں لاتعداد وضعی حکایات وروایات موجود ہیں تو پھر صرف اختلاف والی روایات پر ڈٹ جانا اور اتفاق ومحبت والی روایات کو جھٹلا دینا نہ جانے کس منطق ومصلحت کی رو سے صحیح ہے۔ (لیل ونہار لاہور، ص ۱۴)

اب دیکھئے جناب برقؔ صاحب علماء تاریخ کو تاریخ پر محققانہ نظر ڈالنے کی خود ہی دعوت دے رہے ہیں۔ پھر اس ذیل میں کچھ حقیقتیں بیان ہوجائیں تو برا ماننے کی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد انہیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ یہ تیرہ چودہ برس کی باتیں اب کیوں چھیڑی جاتی ہیں۔

اچھا تو پھر چلئے۔ تاریخ پر محققانہ نظر ڈالئے۔ بے شک یہ حقیقت سامنے آجائے گی یعنی مسلمانوں کی مذہبی تاریخ میں جعلی روایات بہ کثرت موجود ہیں۔ مگر یہ جعلی روایات کے ٹکسال کہاں اور کس غرض سے قائم ہوئے تھے؟ اس کے لئے ابوالحسن علی بن محمد مدائنی کی کتاب الاحداث کا یہ اقتباس کافی ہے کہ:

''معاویہ نے تمام عمال کو لکھا کہ جو شخص حضرت عثمان کی فضیلت میں کسی حدیث کو بیان کرے اس کا پورا نام مع پتہ کے میرے پاس لکھ کر بھیج دو اور پوری طرح جائزہ وانعام سے اسے مالا مال کردو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فضیلت عثمان میں احادیث کثرت سے ہوگئے اور ایک مدت تک یہ سلسلہ قائم رہا، پھر تمام گورنروں کو لکھا گیا کہ عثمان کی فضیلت میں احادیث کا کافی ذخیرہ جمع ہوگیا ہے اب تم دیگر صحابہ کے فضائل میں روایت احادیث کی طرف لوگوں کو دعوت دو اور جو کوئی فضیلت بھی ابوتراب کی نسبت احادیث میں وارد ہوئی ہے اس کے مقابل دوسرے اصحاب کے لئے بھی بیان کرو۔ علیؑ اور ان کے شیعوں کی دلیل باطل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ فرمان لوگوں کے سامنے پڑھا گیا اور سیکڑوں حدیثیں صحابہ کبار کے مناقب میں تصنیف ہوگئیں جن کی کوئی اصلیت نہ تھی۔ واعظین ان کو منبروں پر پڑھتے اور معلمین مکتب بچوں کو یہ قرآن کی طرح حفظ کراتے تھے۔ بلکہ لڑکیوں، عورتوں اور غلاموں تک کو یاد کرانا ضروری سمجھتے تھے۔''

جناب ابوہریرہ کے حالات کا مطالعہ کرلیجئے۔ وہ جنہیں خلیفہ دوم عمر بن الخطاب نے افراط روایت کے جرم پر درے لگائے جنہیں اکابر صحابہ رسولؐ ہمیشہ متہم بالکذب سمجھتے رہے۔ انہیں سیاسی مصالح کی بنا پر خلافت امویہ میں کتنی عظیم اہمیت حاصل ہوگئی کہ آج جمہور کے کتب احادیث ان ہی کے روایات سے چھلک رہے ہیں۔ اس کے برخلاف دوستان حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کو اپنے موافق حقائق بیان کرنے میں حکومتوں کے عتاب کا خطرہ تھا۔ جس کے لئے علامہ ابن حجر مکی کا جناب امیرؑ کے بارے میں یہ قول بڑی قیمت رکھتا ہے کہ وہ ایسی روایت ہے جس کے فضائل کو دشمنوں نے عناد سے چھپایا اور دوستوں نے تقیہ سے۔ مشہور تابعی حسن بصری کا یہ واقعہ یاد رکھنے کا ہے کہ

حضرت رسولؐ خدا سے براہ راست روایت نقل کرتے تھے اور جب پوچھا گیا کہ آپ نے شعور وامتیاز کی عمر میں پیغمبرؐ کا ادراک نہیں کیا ہے، پھر حضرتؐ سے روایات کیوں کر نقل کرتے ہیں تو انہوں نے کہا یہ تمام حدیثیں درحقیقت میں نے علی ابن ابی طالبؑ سے سنی ہیں مگر ایسے دور میں ہوں کہ ان کا نام نہیں لے سکتا۔ لہٰذا براہ راست رسولؐ کی طرف اسناد کرتا ہوں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ جمہور مسلمین کے قدیم ترین احادیث اور تفاسیر اور تواریخ کا جو ذخیرہ موجود ہے وہ جمہور سلاطین کے زیر سایہ تدوین شدہ ہے جب کہ دوستان عترت طاہرین سخت سے سخت قید وبند کی تکالیف وشدائد میں مبتلا تھے۔ ایسے وقت میں جب کہ یہ خود اپنی تاریخ یا اپنی تفسیر اور اپنی حدیث کے ذخائر کی حفاظت پر قادر نہ تھے اور اس کا ثبوت یہ کہ آج فرقہ شیعہ کے پاس جو ذخیرہ احادیث اور فقہیات کا ہے وہ سب چوتھی اور پانچویں صدی کا تالیف شدہ ہے جب کہ اس کے قبل کی صدیوں میں برابر یہ سخت مشکلات میں بھی خدمات دینی وعلمی میں مصروف رہے جسے پوری جستجو کے ساتھ عراق کے وسیع النظر مجتہد علامہ سید حسن صدر کاظمینی اعلی اللہ مقامہٗ نے اپنی کتاب "**تاسیس الشیعه الکرام الفنون الاسلام**" میں درج کیا ہے اور اس کا خلاصہ خود ممدوح کے قلم سے "**الشیعه وفنون اسلام**" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، جس میں ثابت کر دیا گیا ہے کہ تمام علوم وفنون میں تقدم شیعوں کو حاصل ہے۔ پھر یہ تقدم کی واقعیت بس کتب رجال وسیر کے احاطہ میں محدود ہے لیکن وہ قدیم تصانیف اب ہم سے کوئی کہے کہ لا کر دکھاؤ تو ہم ان کے پیش کرنے سے قاصر ہیں یہاں تک کہ اصحاب ائمہ معصومین علیہم السلام کی چار سو کتابیں احادیث کی جو کہ ''اصول اربعمائۃ'' کہلاتی تھیں۔ آج دنیا سے ناپید ہیں۔ جب ہمارا عالم یہ تھا کہ ہم اپنی کتابوں کے تحفظ سے قاصر تھے تو ہمارے لئے یہ کہاں ممکن تھا کہ ہم اکثریت کے علمی تصانیف پر اثر انداز ہوتے مگر یہ حقیقتوں کا لاشعوری جذبہ تھا جس نے خود جمہور کی کتابوں کے اندر ان جواہرات کو بھی محفوظ کرا دیا جو مصنوعی خزف ریزوں کے ساتھ درج ہو گئے۔

ہمیں جب چوتھی پانچویں صدی میں زمانہ نے اتنا موقع دیا کہ ہم تاریخ وسیر وغیرہ پر بھی کچھ کام کریں تو ہمارے سامنے اپنا کوئی ذخیرہ تھا ہی نہیں ہمارے سامنے بس وہی سرمایہ تھا جو ہمارے برادران بزرگ کا جمع کردہ تھا، اس لئے ہم نے اسی کو اپنے ذوق وبصیرت اور سینہ بسینہ حاصل کیا معلومات کے چھاجوں میں پھٹک پھٹک کر وہ حصہ لیا جو ہمارے نزدیک اصلیت کا جامہ پہنے ہوئے تھا یا جو ہماری حقانیت کے لئے مستند کی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر کچھ لاشعوری طور پر اور کچھ کسی خاص تاویل اور توجیہہ کے تخیل سے ایسے روایات بھی آ گئے جن کے کسی حیثیت سے ہمارے خلاف پڑنے کا تصور ہو سکتا ہے۔

یہ دو صورتیں جنہیں ہم نے ''لاشعوری'' اور ''تاویل کے تخیل'' سے تعبیر کیا ہے واضح الفاظ میں یہ ہیں کی بعض علماء کا تو ذہن ان کے مخالف پہلوؤں کی طرف گیا نہیں اور بعض نے اپنی ذہانت سے کچھ ایسے تاویلات اور توجیہات سوچ لئے جن کے وہ روایات ہمارے خلاف نہیں رہتے موافق ہو جاتے ہیں اس لئے انہیں درج کر دیا۔ کبھی یہی وہ چیزیں ہوتی ہیں جن سے ہمارے خلاف استدلال کیا جاتا ہے۔

حالانکہ تاریخی حالات کے اس صحیح جائزہ سے جو اجمالی طور پر ہم نے گذشتہ سطور میں پیش کیا ہے۔ یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وضع احادیث کے اس سیلاب سے جس کا جناب برقؔ نے تذکرہ کیا ہے وہ حدیثیں مشکوک نہیں ہو سکتیں جو اقلیت کے نقطہ نظر کی مؤید ہیں اور وہ اپنے حقانیت کے بے پناہ زور سے سلطنت وقت کے اہتمام وتشدد کے باوجود جمہور کی کتابوں میں درج ہو گئیں ہیں بلکہ وہی روایتیں مشکوک ہوتی ہیں جو اکثریت کے نقطہ نظر کی کسی طرح تائید میں شعوری یا لاشعوری طور پر اقلیت کے لٹریچر میں آ گئی ہیں۔ اس کے بعد یہ اپنی اکثریت واقتدار کے زعم والی ایک دھاندلی ہی سمجھی جا سکتی ہے کہ ہمیں یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ

ہم وہ روایتیں قبول کرلیں جو اکثریت کے موافق ہیں اور اکثریت کو رائے نہیں دی جاتی کہ وہ ان ہی احادیث کو تسلیم کرلیں جو ان کے جوامع و مسانید میں شیعوں کی موافقت میں موجود ہیں اور جن کے مان لینے سے اختلاف رفع ہوجائے گا اور ملت اسلامیہ کا شیرازہ مجتمع و منظم ہوجائے گا۔

کہاں تو جناب برقؔ صاحب کا یہ موعظہ بالغہ کہ اب چودہ سو برس ادھر کے واقعات کے چھیڑنے سے کیا فائدہ اور کہاں ایک دم ان کا خود اپنے دل کے تقاضے سے مجبور ہوکر یہ فرمانے لگنا کہ: "میرا ایمان یہ ہے کہ حضرت علیؑ کے تعلقات خلفائے ثلاثہ سے نہایت عمیق اور مخلصانہ تھے۔ کتب تاریخ میں بعض شکر رنجیوں کا بھی ذکر ملتا ہے لیکن یہ شکر رنجیاں محض عارضی تھیں جن کا اثر مستقل تعلقات مہر وولا پر قطعاً کوئی نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے کہ یہ سب اسلام کی حبل متین میں بندھے ہوئے تھے۔ ان کا خدا ایک، کعبہ ایک، قرآن ایک، رسول ایک، سب کے سب خواہشات نفسانی سے عاری، اللہ کے سپاہی، بے نفس، نہ دنیا کی لالچ، نہ منصب کی خواہش، کھدّر پہننے والے، ستو اور کھجوریں کھانے والے، سوسو پیوند والے پیراہن پہننے والے، سب کچھ اللہ کی راہ میں دے ڈالنے والے، بھلا یہ لڑتے تو کیوں اور ایک دوسرے سے کھنچتے تو کس مقصد کی خاطر۔

(لیل ونہار، لاہور، ۲۵؍اگست ۱۹۵۷ء، ص ۱۴)

اب ایمان تو دل کے اندر کی چیز ہے۔ ہمیں کیا حق ہے کہ ہم آپ کے اس عقیدہ کا اس معنی سے انکار کریں کہ وہ آپ کا عقیدہ نہیں ہے مگر ظاہر ہے کہ نہ سب کے دل آپ کے دل کے ایسے ہیں نہ سب کے دماغ آپ کے دماغ کے مثل ہوسکتے ہیں۔

آپ کو یہ حق تو پہنچ نہیں سکتا اور نہ قدرت حاصل ہے کہ آپ اپنے ایمان کو تمام کے دلوں اور دماغوں پر مسلط کرسکیں لہٰذا بہت ممکن ہے اور حقیقت ہے کہ دوسرے بہت سے لوگ آپ کے اس عقیدے کے خلاف ایمان رکھتے ہیں۔ تو اگر آپ اپنے اس ایمان کو دل کے اندر رکھنا لازم نہیں سمجھتے بلکہ ملاء عام میں روز روشن کی روشنی میں "لیل ونہار" کے صفحات پر جس کی ہزاروں تک اشاعت ہے اسے شائع کرنا جائز سمجھتے ہیں تو آپ کو دوسروں پر جو اس کے خلاف ایمان رکھتے ہیں قدغن کرنے کا کہ وہ اپنے ایمان کو کھلے بندوں ظاہر نہ کریں کیا جواز ہوسکتا ہے؟

یہ بڑی مشکل ہے کہ آپ ان مسائل کو چھیڑتے بھی ہیں اور ان پر بحث ہونے سے پھر چڑھتے بھی ہیں۔

آپ یہ فرمائیں کہ "میرا ایمان یہ ہے کہ حضرت علیؑ کے تعلقات خلفاء ثلاثہ سے نہایت عمیق اور مخلصانہ تھے۔ اور کوئی دوسرا آپ کے یہاں کی مستند ترین کتاب صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے یہ پیش کرنے کی ہمت نہ کرے کہ:

فوجدت فاطمة على ابى بكر فى ذٰالك فهجر حبته فلم تكلمت حتى توفيت۔ فلما توفيت دفينها زوجها على ليلا ولم يوذن بها ابابكر وصلى عليها وكان لعلى بين الناس وجد فى حيوٰة فاطمه فلما توفيت استنكر على وجوه الناس فالتمس مصالحة ابى بكر۔

جائدادیں ضبط ہوں، مظلوم کے تاثرات کی یہ حد پہنچے کہ وہ عمر بھر نہ بات کرے، فریق مخالف کی جنازہ پر شرکت تک گوارہ نہ کی جائے، بیعت یعنی تسلیم حکومت سے علٰحدگی رکھی جائے اور بقول بخاری جناب فاطمہؑ کی وفات کے بعد مجبوراً مصالحت کرلی جائے۔

یہ سب آپ کے نزدیک شکر رنجی ہے اور اس کے بعد بھی تعلقات نہایت عمیق اور مخلصانہ رہتے ہیں تو پھر کشیدگی اور نزاع اور اختلاف کس چیز کا نام ہوتا ہے۔

پھر اگر کسی نے مزید تلاش کرلی اور اسے متعدد معتبر تاریخوں میں دروازے پر لکڑیاں جمع کرنا اور آگ لگانے کا اہتمام مل گیا اور اس موقع کی درشت کلامیوں پر نظر پڑگئی تو وہ کس طرح آپ کے دل کے ایمان کو اپنے دل و دماغ کے اندر جذب کرسکتا ہے؟ اس کا حل پھر وہی ہوسکتا ہے کہ آپ کا ایمان آپ کے ساتھ اور ہمارا ایمان ہمارے ساتھ یعنی **لكم دينكم ولى دين**

اس زمانہ میں اگر روایت سے زیادہ درایت پر اعتماد کیا جاتا ہے، تو دیکھ لیجئے کہ وہ جو پیغمبرؐ خدا کے دور میں ہر جہاد کا فاتح ہے اس دور میں روم وایران کے فتوحات والے ''جہادوں'' میں بھی کہیں نظر آتا ہے؟ اور اگر نہیں اور واقعہ یہ ہے کہ کہیں نہیں اب تو ہر جگہ خالد بن ولید ہیں ابوعبیدہ جراح ہیں، سعد بن ابی وقاص ہیں، کہیں بھی علی بن ابی طالبؑ نہیں ہیں تو یہی اس کے سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ وہاں بس کبھی کبھی کی وقتی شکر رنجی تھی یا کوئی مستقل نزاع یا اصولی اختلاف؟

اگر علمی مہمات کو دیکھا جائے تو جمع قرآن کی ایسی مہتم بالشان مہم اور اسے اس کاوش کے ساتھ انجام دیا گیا کہ اور صحابیوں سے گواہیاں لے لے کر آیتیں درج کی گئیں، زید بن ثابت ایسے نوعمر صحابی کے خدمات حاصل کئے گئے مگر اسے نہیں بلایا گیا جس کا علم قرآن مسلم تھا اور جسے عَلِيٌّ مَعَ الْقُرْآنِ وَالْقُرآنُ مَعَ عَلِيٍ کی سند حاصل تھی۔ کیا یہ کسی معمولی شکر رنجی ہی کا نتیجہ ہوسکتا ہے؟

تفسیر قرآن میں علمی تشنگی کو کعب الاحبار اور عبداللہ بن سلام ایسے نومسلم یہودیوں کی مدد سے دور کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کا ذخیرہ ''تفسیر''، ''اسرائیلیات'' کا مجموعہ بن جاتا ہے مگر اس ذات سے استفادہ عار سمجھا جاتا ہے جسے حضرت پیغمبرؐ خدا أَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا کے الفاظ سے مرکز علم قرار دے چکے تھے۔

کیا یہ صرف شکر رنجی کہی جاسکتی ہے جس کی بنیاد پر اتنے بڑے علمی خسارے گوارہ کرلئے جائیں مگر اس کی شخصیت کی اہمیت کا اعتراف کرنے سے گریز کیا جائے؟

یہ آپ کی منطق کہ ان میں ''اختلاف ہونا بھی کیسے کہ یہ سب اسلام کی حبل متین میں بندھے ہوئے تھے، ان کا خدا ایک، کعبہ ایک، قرآن ایک، رسول ایک، سب کے سب خواہشات نفسانی سے عاری، اللہ کے سپاہی، بےنفس، بےغرض، نہ دنیا کی لالچ، نہ منصب کی خواہش، کھدّر پہننے والے، ستو اور کھجوریں کھانے والے، سوسو پیوند والے پیرہن پہننے والے، سب کچھ اللہ کی راہ میں دے ڈالنے والے، بھلا یہ لڑتے تو کیوں اور ایک دوسرے سے کھنچتے تو کس مقصد کی خاطر۔''

اللہ اکبر زور قلم اتنا تو ہو کہ ملاء اعلیٰ کے کروبین کی تصویر کھنچ گئی۔

گستاخی معاف! یہ صحابہ کرام کے اوصاف کا مرقع جو کھینچا گیا ہے، اس میں انصار کا بھی حصہ تو ہونا چاہئے کہ وہ شرف صحابیت سے مشرف ہیں، بدر و احد کے مجاہدین ہیں، وہ ہیں جنہوں نے اپنا گھر بار، مال و اولاد سب پیغمبرؐ اسلام کے قدموں پر نثار کردیا۔ پھر آخر رسولؐ خدا کی وفات کے ساتھ ہی جب کہ ابھی جسد مبارک دفن بھی نہ ہوا یہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں معرکہ آرائی کیوں ہوئی؟ حضرت سعد بن عبادہ کی خلافت کا منصوبہ کس لئے بن گیا؟ پھر فرض کرلیجئے کہ انصار ان جوہروں سے عاری تھے تو آپ کے مہاجرین اولین ہی نے بےغرضی سے کام لیا ہوتا۔ کہ تخت خلافت پر ان ہی کو قابض ہوجانے دیتے۔ بقول آپ کے'' انہیں تو نہ دنیا کی لالچ، نہ منصب کی خواہش، کھدّر پہننے والے، ستو اور کھجوریں کھانے والے، سوسو پیوند والے پیراہن پہننے والے، سب کچھ اللہ کی راہ میں دے ڈالنے والے'' پھر آخر کون آفت آرہی تھی کہ جنازہ رسولؐ تک کو چھوڑ دیا اور فوراً سقیفہ بنی ساعدہ میں پہنچنا ضروری سمجھا گیا پھر وہاں ان ''فرشتگان قدس'' کے جوڑتوڑ لچھے دار تقریریں ہی نہیں بلکہ اوس وخزرج کی زمانہ جاہلیت کی رقابت کے جذبات کو ابھارنا اور اس سے فائدہ اٹھانا اور اس کے بعد ''مشاجرہ لفظی'' ہی نہیں بلکہ ہاتھا پائی اور نوچا کھسوٹی تک نوبت پہنچنا۔ یہ سب آخر کیا تھا؟

اگر کہیئے کہ امر خلافت میں یہ اختلاف کسی دنیوی غرض سے نہ تھا بلکہ یہ مفاد دینی کے ماتحت انصار کی خلافت کو درست نہیں سمجھتے تھے، اس لئے یہ سب کچھ ہوا تو پھر حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے اختلاف کو بھی وجہ دینی پر مبنی کیوں نہیں قرار دیا جاتا اور ان کے زہد وتقویٰ وغیرہ کو پیش کرکے اس نزاع واختلاف کی

نفی کیوں کی جاتی ہے؟

افسوس ہے اس ذہنیت پر کہ ان کو بےنفس، بےغرض وغیرہ دکھانے کے ساتھ پھر ان کی باہمی رشتہ داریاں دکھائی جارہی ہیں۔ کیا کسی بےنفس و بےغرض ہستی کو اصولی اور دینی اختلاف سے رشتہ داریاں سدّ راہ ہوسکتی ہیں؟

دیکھ رہے ہیں کہ حلال خدا کو حرام کیا جارہا ہے اور حرام خدا کو حلال کیا جارہا ہے۔ اذان و نماز میں سنتوں پر قدغن ہورہاہے اور بدعتوں کی ترقی وترویج ہورہی ہے۔ اور پھر تیسرے دور میں تو ذاتی قرابتوں پر پورے تمدن اسلامی کے تقاضوں کو قربان کردیا جاتا ہے۔ اور پھر صرف کچھ واقعی اور کچھ مفروضہ رشتہ داریوں کی بناپر یہ سمجھا جائے کہ ان کو اختلاف نہیں ہوسکتا تو اس سے بڑھ کر ان کی بےنفسی بےغرضی اور بےلوثی پر حملہ ہی کیا ہوسکتا ہے؟

مجھے افسوس ہورہا ہے کہ کہاں مضمون کی یہ سرخی کہ ''عشرۂ محرم اور مسلمانان پاکستان'' اور کہاں اس کے ذیل میں صدر اسلام کے یہ تلخ تذکرے۔ مگر اس کی سراسر ذمہ داری جناب ڈاکٹر برقؔ پر ہے ورنہ دنیا کو معلوم ہے کہ میں اتحاد بین المسلمین کا کتنا حامی ہوں اور بالخصوص عزائے حضرت سید الشہداء امام حسینؑ میں اسی نقطۂ نظر کا حامی ہوں کہ اسے تمام مسلمانوں کے اشتراک کے انداز پر ہونا چاہئے اور نزاعی مسائل کو اس کے اندر داخل نہیں ہونا چاہئے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ایک فریق میں اس موقع پر اپنی ممدوح شخصیتوں کی مدح وثنا کا جواز حاصل کرے اور پھر بھی اس کی مقابل حقیقتیں سامنے نہ لائی جائیں۔ یہ اپنے جذبات ہی کا خون کرنا نہیں ہے بلکہ حقائق تاریخ اور حقائق دین دونوں پر ایک ظلم ہے۔

پھر بھی ہم نے اس محل پر مجمل اشاروں پر اکتفا کی ہے اور اس کی تفصیل اور مکمل حوالوں کے ساتھ اثبات کو جس میں مناظرانہ انداز پیدا ہوجاتا اس موقع پر چھوڑا ہے کہ جب جناب برقؔ صاحب اپنے ممدوحین کی نادان دوستی میں دھاندھلی سے کام لے کر ان حقیقتوں کا انکار فرمائیں۔ خدا کرے اس کا موقع نہ آئے۔

وہ لیجئے جناب برقؔ صاحب اپنے ایمان اجمالی کے بعد کہ ''حضرت علیؑ کے تعلقات خلفائے ثلاثہ کے ساتھ مخلصانہ تھے۔'' تفصیل کے میدان میں آگئے اور اب خالص مناظرانہ پارٹ ادا کرتے ہوئے بالکل وہی سب کہنے لگے جو ہمیشہ مولوی عبدالشکور صاحب لکھنوی مواقف مناظرہ میں اور صفحات النجم وآفتاب پر کہتے آئے ہیں اور جس قسم کی بہت سی باتوں کو جمع کرکے انہوں نے اپنے ادارہ ''النجم'' سے ''ابوالآئمہ کی تعلیم'' نامی رسالہ شائع کیا تھا۔ جس کے بعد امامیہ مشن لکھنؤ سے ''ابوالآئمہ کے تعلیمات'' رسالہ منظر عام پر آیا۔ اب جناب برقؔ صاحب ویسی ہی باتوں کو ''لیل ونہار'' کے صفحات پر سامنے لارہے ہیں:۔

پہلی بات

''وہ قرابت کے بندھنوں سے بندھے ہوئے تھے صدیق وعمر حضور صلعم کے سسر تھے اور عثمان وعلیؑ داماد پھر حضرت ابوبکر کی وفات کے بعد ان کی زوجہ اسماء سے حضرت علیؑ نے عقد کرلیا تھا اور ایک بیٹی ام کلثوم (معاذ اللہ) حضرت عمر کے عقد میں دے رکھی تھی۔''

اب کون برقؔ صاحب کے دل میں ڈال کر ان کو یہ سمجھا سکتا ہے کہ ایک شیعہ کے لئے ام کلثوم کو بنت علیؑ وفاطمہ فرض کرکے خلیفہ دوم کے ساتھ ان کے عقد کا غلط فسانہ اس سے زیادہ دل آزار ہے۔ جتنا آپ کے لئے فدک وغیرہ کا واقعی تذکرہ اور اس کے ثبوت میں آپ نے شیعوں کی کتاب حدیث **تہذیب الاحکام** سے جو روایت نقل کی ہے وہ خود اس کا ثبوت ہے کہ وہ ام کلثوم جنہیں بنت علیؑ سے تعبیر کیا ہے دختر علیؑ وفاطمہؑ نہ تھیں اس لئے کہ اس روایت میں یہ ہے کہ ان کا اپنے بیٹے زید بن عمر کے ساتھ ہی انتقال ہوگیا تھا اور وہ ام کلثوم جو دختر حضرت علیؑ وفاطمہؑ علیہم السلام تھیں بلاشبہ واقعہ کربلا تک موجود تھیں۔

جب کہ یہ معلوم ہے کہ ام کلثوم بنت ابی بکر خلیفہ دوم کے عقد میں تھیں اور خود آپ نے ابھی ذکر کیا ہے کہ خلیفہ اول کی بیوہ اسماء بنت عمیس کے ساتھ حضرت علیؑ نے عقد فرمایا تھا۔ اس لئے محمد بن ابی بکر بھی آپ کے ربیب ہونے کی بنا پر آپ کے بیٹے کہلاتے تھے اور اسی طرح آپ کی بہن ام کلثوم بھی۔ اب اس کے بعد آپ کا اس رشتہ کو حضرت ام کلثوم بنت علیؑ سے وابستہ کرنا زیادتی نہیں تو کیا ہے؟

اب آپ نے تو دل دکھا دیا، وہ کوئی بات نہیں اور اگر کہیں آپ کے ان رشتوں کے جواب میں یہ کہہ دیا جائے کہ جتنے یہ رشتے آپ نے بیان کئے ہیں سب ابوسفیان ہی نہیں بلکہ مشرک ابولہب اور یہودی حی بن اخطب کے ساتھ بھی وابستہ تھے لہٰذا آپ کی منطق کی رو سے جنگ صفین میں حضرت علیؑ اور معاویہ کی باہمی معرکہ آرائی کو بھی بے اصل ہونا چاہئے کیوں کہ وہ قرابت کے بندھنوں میں بندھے ہوئے تھے۔ اور حی بن اخطب کے بعد اس کی بیٹی سے رسولؐ اللہ نے عقد فرمایا تھا لہٰذا پیغمبرؐ کی اس سے بھی کوئی نزاع درست نہیں ہوسکتی اور آپ کے تاریخی روایات کے مطابق رسولؐ کی دامادی کے رشتہ میں ابولہب کے فرزند بھی منسلک تھے لہذا اس کے بعد تو توحید اور شرک کا بھی اختلاف ختم ہی معلوم ہوتا ہے۔ ذرا خود ہی غور کیجئے یہ کتنی مضحکہ خیز منطق ہے۔

دوسری بات

فروع کافی کے حوالہ سے لکھا گیا ہے کہ:

''حضرت امام جعفرؑ کی ایک طویل حدیث منقول ہے جس میں ابوبکر او ابوذر غفاری اور سلمان فارسی کا ذکر ہے اور آخری جملہ یہ ہے "ومن از ھذا من ھٰولاء" ان تینوں سے بڑا پرہیزگار کون تھا۔''

اب ذرا یہ عنوان نقل ملاحظہ ہو۔ فروع کافی، آپ جانتے ہیں؟ یہ نام ہے طہرانی چھاپے کے بڑے سائز کی دو جلدوں کا جو تقریباً ایک ہزار صفحات کی ہیں۔ ان میں سے یہ حدیث کس جلد میں اور کس صفحہ پر ہے پھر اس مہمل حوالہ کا سوا اس کے کیا فائدہ ہے کہ اگر کوئی مکمل ورق گردانی کر کے تلاش بھی کر لے اور اس حدیث کو نہ پائے تب بھی اپنی آنکھوں پر تہمت رکھے کہ اتنی بڑی کتاب میں کہیں ہوگی۔ میری نظر نہ پڑی ہوگی۔

پھر روایت اگر موجود بھی ہو تو اس کی روایتی حیثیت کیا ہے؟ مرسل ہے یا مسند؟ مرفوع ہے یا مقطوع؟ سند متصل ہے یا صحیح؟ حسن ہے موثق ہے یا ضعیف؟ اس کے بعد ہر منزل ہے کہ متن حدیث پر نظر کی جائے، سیاق کو دیکھا جائے، مخاطب پر نظر ڈالی جائے کہ کس مسلک کا شخص ہے۔ پھر جو نام لئے گئے ہیں وہ کلام امام میں ہیں یا کلامِ راوی میں؟ محل ورود بھی دیکھا جائے کہ کیا ہے؟ ایک تو صورت یہ ہوتی ہے کہ اصحاب رسولؐ کے اوصاف بیان ہو رہے ہیں اور ان کی قدر و منزلت کی تعیین ہی موضوع گفتگو ہو۔ یہاں پر اگر یہ ذکر اس طرح ہوا ہو تو اس کا خاص وزن ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بعد والے مسلمانوں کی دنیا طلبی اور اس کے بالمقابل اضافی طور پر سابق زمانہ والوں کی سادہ زندگی کا ذکر ہو وہاں یہ فقرہ آئے تو اس کا دوسرا مرتبہ ہے۔

سوا انتہائی متعصب اور جھگڑالو قسم کے افراد کے ذرا بھی سنجیدہ اور معاملہ فہم شخص ہو تو وہ ہر ہر موقع پر اپنے اصولی یا مذہبی اختلاف کا اعلان نہیں کیا کرتا۔ آج مجھ سے بھی کسی سنی دوست سے گفتگو ہو رہی ہو اور وہ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کے انقلابات کا ذکر کرتے ہوئے ضمناً جناب سلمان اور ابوذر رضوان اللہ علیہما کے ساتھ کوئی نام لے دیں، تو میں ان سے اس موقع پر الجھنے کی کوشش نہ کروں گا کہ تم نے ان ناموں کے ساتھ یہ نام کیوں لے لیا بلکہ مجموعی طور پر یہ کہہ دوں گا کہ ان لوگوں میں جیسا زہد و ورع تھا ویسا اب کہاں! اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ میں ان شخصیتوں میں سے ہر ایک کے متعلق مخاطب کے نقطۂ نظر سے بالکل متفق ہی ہوں۔ پھر اس کے بعد یہ بھی قابل غور بات ہے کہ کیا مطلق زہد واقعی بلند وصف ہے؟ جب کہ احادیث سے پتہ چلتا ہے اور علمائے اخلاق نے بھی لکھا ہے کہ کبھی زہد فی الدنیا

للدنیا بھی ہوتا ہے۔

یہ اس مفروضہ پر ہے کہ یہ حدیث واقعی وجود رکھتی ہو اور معتبر ہو حالانکہ حقیقتاً ایسا ہے ہی نہیں۔

اس کے برخلاف فروع کافی میں امام جعفر صادقؑ کا جو مکالمہ ابن ابی لیلیٰ قاضی سے ہے اس میں بڑے لطیف عنوان سے سیرت شیخین پر عمل کرنے کو منع کیا ہے چنانچہ اس میں ہے کہ حضرت نے ابن ابی لیلیٰ سے پوچھا کہ تم فیصلے کس چیز سے کرتے ہو؟ انہوں نے کہا **هما بلغني عن رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم وعن علي وعن ابي بكر وعمر۔** ''جو مجھے رسول خداؐ کی طرف سے پہنچتا ہے اور حضرت علیؑ اور ابوبکر وعمر کی طرف سے۔ حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

''تم تک یہ حدیث بھی پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا انّ علیا اقضا کم انہوں نے کہا بے شک یہ حدیث پہنچی ہے۔ امام نے فرمایا: پھر تم حضرت علیؑ کے فیصلہ کے سوا کسی اور کے فتوے کی رو سے کیوں کر فیصلہ کرتے ہو۔

(فروع کافی ج ۲، ص ۳۵۷)

حالانکہ مخاطب کے مذہب ومسلک کو سامنے رکھتے ہوئے اصولی اختلاف کو یہاں بھی نمایاں نہیں کیا گیا ہے۔ پھر بھی اس سے حضرت امام جعفر صادقؑ کا صحیح نقطۂ نظر ابوبکر وعمر کی نسبت ظاہر ہے۔ اس کے بعد حضرت کی طرف کسی ایسے قول کی نسبت کہاں درست ہو سکتی ہے جو بنیادی طور پر مذہب جعفری کے خلاف ہو۔

تیسری بات

لکھا ہے کہ حضرت باقرؑ کا ارشاد ہے **لست بمنكر فضل ابي بكر ولست بمنكر فضل عمر ولكنّ ابابكر افضل**، میں ابوبکر وعمر کی فضیلت سے منکر نہیں بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ ابوبکر کا درجہ بلند تر تھا۔ اس میں کتاب احتجاج کا حوالہ دیا گیا ہے اور غالباً خود مضمون نگار کو بھی کسی اور کے حوالہ پر پورا بھروسہ ہو گیا اس لئے جرأت کر کے صفحہ بھی درج کر دیا یعنی صفحہ ۲۰۴ جس کے لئے ہم شکر گذار ہیں کہ ہمیں تلاش میں آسانی ہو گئی۔ اب نتیجۂ تلاش کے سننے کے پہلے ذرا احتجاج کی نوعیت اور اس کی ترتیبی کیفیت سن لیجئے۔

کتاب احتجاج ان مناظرات کا مجموعہ ہے جو معصومین علیہم السلام اور ان کے اصحاب نے مخالفین مذہب سے کئے ہیں۔ اس کی ترتیب باعتبار ترتیب معصومین علیہم السلام ہے یعنی سب سے پہلے جناب رسالت مآبؐ کے مناظرات ہیں اور پھر یکے بعد دیگرے دوسرے معصومینؑ کے۔ اب چوں کہ مناظرہ میں مخاطب مخالف مذہب ہی ہوتا ہے اور مقام مناظرہ وہ ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ ایسا علمبردار توحید استفہام یا مماشاۃ خصم وغیرہ کے طور پر متعدد معبودان باطل کے لئے باری باری هٰذا ربّی کی لفظیں تک کہہ دیا کرتا ہے اس لئے قبل تلاش کوئی بعید بات معلوم نہیں ہوتی کہ امام محمد باقر علیہ السلام کی زبان مبارک پر کسی مناظرہ کے موقع پر کسی حیثیت سے یہ الفاظ جاری ہوئے ہوتے جن سے اصل مقصود مخالف کو قائل کرنا ہوتا مگر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ہم نے کتاب کے صفحہ ۲۰۴ پر نظر کی اور یہ دیکھا کہ یہاں امام محمد باقرؑ کے مناظرات کا تو ذکر ہی نہیں ہے بلکہ اس صفحہ پر تو امام موسیٰ کاظمؑ کے مناظرات ختم ہوئے ہیں اور آخری سطر سے امام رضاؑ کے مناظرات شروع ہوئے ہیں۔ حوالہ کے غلط ہونے کے لئے تو اتنا ہی کافی تھا مگر ہم نے امام محمد باقرؑ کے مناظرات پر بھی نظر کی جو صفحہ ۱۶۷ سے صفحہ ۱۷۳ تک تقریباً ۶ صفحات میں ہیں مگر ان میں بھی کہیں مذکورہ الفاظ نظر نہیں آئے۔ ہاں ایک گفتگو میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی زبان پر خلفائے ثلاثہ کا نام آیا ہے مگر وہ اس طرح کہ حضرت نے فرمایا:

ما اكثر ظلم كثير من هٰذه الامة لعلي ابن ابي طالب واقل انصافهم له يمنعون عليا ما يعطونه سائر الصحابة وعلي افضلهم فكيف يمنع منزلة يعطونها غيره۔

اس امت کی اکثریت حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے

ساتھ ظلم کرتی اور کتنا کم انصاف کرتی ہے کہ وہ حضرت علیؑ سے وہ سلوک بھی نہیں کرتی کہ جو وہ دوسرے صحابہ کے ساتھ کرتی ہے حالانکہ حضرت علیؑ ان سب سے افضل ہیں تو پھر کیوں جتنا دوسروں کے ساتھ کیا جاتا ہے اتنا بھی آپ کے لئے نہیں کیا جاتا۔ کسی نے کہا یہ کیوں کر؟ فرمایا وہ یوں کہ اگر تم ابوبکر سے موالات رکھتے ہو تو ان کے دشمنوں سے نفرت ضرور کروگے کوئی بھی ہوں۔ اسی طرح عمر بن خطاب کو دوست رکھوگے تو ان کے دشمنوں سے برأت کروگے جو بھی ہوں۔ اسی طرح عثمان سے محبت رکھتے ہو تو ان کے دشمنوں سے تبرّا کروگے وہ جو بھی ہوں۔ مگر جب حضرت علیؑ ابن طالبؑ کی بات آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم ان کو دوست تو رکھتے ہیں مگر ان کے دشمنوں سے برأت نہیں کرتے پھر آخر یہ ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے؟

اس مناظرہ کے علاوہ اور کہیں ان مناظرات میں شیخین کا ذکر نہیں ہے۔

چوتھی بات

لکھا ہے کہ "کشف الغمہ میں امام جعفرؑ کا یہ قول درج ہے: ایک سپاہی یا معمولی فوجی افسر کی تھی جس کا میدان جنگ سے ہٹنا اسلام کے مرکزی اقتدار کو کوئی اساسی صدمہ نہیں پہنچا سکتا تھا لیکن اس وقت وہ شخصیت دنیا میں اہمیت حاصل کر چکی تھی اور تمام مسلمانوں کے حاکم اعلیٰ اور مرکزی حکومت اسلام کے سربراہ کی حیثیت سے متعارف تھی جو اصولی طور پر کتنی غلط ہو مگر غیر مسلم دنیا کی نظر میں بہرحال وہ ایک تاریخی واقعیت تھی لہٰذا اس وقت ویسی کوئی صورت پیش آنا وقار اسلام کے لئے بڑی مہلک ضرب تھی۔ اسی پہلو کو حضرت امیرؑ نے نہایت مستحسن الفاظ میں پیش فرمایا اور اس طرح کہ جناب خلیفہ دوم کو بھی موقع کی نزاکت کا احساس ہو گیا اور انہوں نے بھی کسی پر خود غلط زعم شجاعت سے کام نہ لیتے ہوئے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

یہاں یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ متفق علیہ حدیث رسولؐ ہے کہ:

المستشار مؤتمن جس سے ظاہر ہے کہ مشورہ لینا بھی ایک امانت کا سپرد کرنا ہے۔ اور امانت داری وہ چیز ہے کہ بعد بعثت بھی ہجرت کے قبل تک مشرکین کی امانتیں حضرت پیغمبرؐ خدا کے پاس موجود تھیں مگر اس سے یہ تو ثابت نہیں ہو سکتا کہ آپ کو مشرکین سے کوئی اصولی اختلاف نہ تھا یا یہ کہ مشرکین سے آپ کو کوئی صدمہ نہ پہنچا تھا، پھر اگر مشرکین کے لئے امانت داری سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کے تعلقات کا خوش گوار ہونا ثابت نہیں ہوتا تو ان کے حقیقی جانشین حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کا کسی کے ساتھ امانت داری کے فریضہ کو انجام دینا ان کی باہمی تعلقات کی خوش گواری کا ثبوت کیوں کر ہو سکتا ہے؟

یہاں کافی کی ایک حدیث بھی کافی اہمیت رکھتی ہے:

قال ابو عبداللہ فی وصیتہ اعلم ان ضارب علی باالسیف وقاتلہ لو ائتمننی واستنصحنی واستشارنی ثم قبلت ذٰلك لاڈیت الیہ امانتہٗ۔

حضرت امام جعفرؑ صادق نے اپنی ایک وصیت کے ذیل میں فرمایا یہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ حضرت علیؑ کو تلوار لگانے والا اور آپ کا قاتل ابن ملجم بھی اگر مجھے امین قرار دے اور مجھ سے نصیحت چاہے اور مشورہ طلب کرے اور میں اسے مشورہ دینا منظور کرلوں تو میں اس کے لئے بھی امانت داری اپنا فریضہ سمجھوں گا۔

"فمن لم یقل لہ الصدیق فلا صدق اللہ قولہ فی الدنیا والاٰخرۃ۔ جو شخص ابوبکر کو سچا نہ سمجھے خدا اسے دنیا وآخرت میں جھوٹا کرے۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ ہماری ان کتابوں میں جیسے کہ کشف الغمہ ہے عموماً روایات اہل سنت کے کتب سے ماخوذ ہیں اس لئے اس مقالہ کی کسی گذشتہ قسط میں ہم نے لکھا ہے کہ بعض روایتیں ایسی آگئیں ہیں کہ جو کسی اعتبار سے ہمارے خلاف استعمال کی جاتی ہیں اور بعض علماء اس پر ملتفت نہیں ہوتے اور بعض نے اس کا مفہوم اور کچھ قرار دیا اور کشف الغمہ میں تو دیباچہ میں لکھ دیا ہے کہ:

اعتمدت فی الغالب النقل من کتب

الجمهور۔ میں نے زیادہ تر سنیوں کی کتابوں سے مضامین نقل کئے ہیں اس لئے ہوسکتا تھا کہ مذکورہ قول کشف الغمہ میں کہیں پر ہوتا ہم ہم نے اسے تلاش کیا تو ظاہر ہے کہ یہ قول یا تو خلیفہ اول ابوبکر کے حالات میں ہوتا، وہ اس کتاب میں سرے سے ہیں ہی نہیں۔ کیوں کہ یہ کتاب چہاردہ معصومینؑ کے حالات میں ہے خلفاء کے حالات میں نہیں ہے۔ یا پھر امام جعفر صادقؑ کے حالات میں اسے ہونا چاہئے جو اس کتاب کے طہرانی چھاپے میں صفحہ ۲۲۲ سے صفحہ ۲۴۱ تک ہیں مگر اسے کیا کیا جائے کہ ان میں بھی ہم کو تلاش سے یہ فقرہ نہیں ملا۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اس کتاب میں کہاں ہوسکتا ہے؟

پانچویں بات

حضرت عمر نے غزوۂ روم اور فارس میں خود بہ نفس نفیس جانے کے لئے حضرت علیؑ سے مشورہ کیا تو آپ نے منع فرمایا جس کا نہج البلاغہ میں تذکرہ ہے۔ اس پر ہم نے ایک مقالہ میں جو امامیہ مشن لکھنو کی طرف سے شائع ہو چکا ہے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی بلند نفس کے اختلاف کو اپنی پست ذہنیت کے معیار پر جانچنا نہیں چاہئے کہ جس سے ہم خفا ہیں پھر چاہے اس ذیل میں کسی بلند مقصد کو نقصان بھی پہنچ جائے مگر اس شخص کے ساتھ ہر معاملہ میں ہم اس رنجش اور نزاع کو دخل ضرور دیں گے۔ بلند نفوس کے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ حضرت علیؑ کے سامنے مفاد اسلام اور وقار اسلام کا سوال رہتا تھا۔ خلیفۂ دوم نے روم اور فارس جانے کا مشورہ لیا تو سوال یہاں فقط خلیفۂ دوم کی زندگی کے خطرہ میں پڑنے کا نہ تھا بلکہ وقار اسلامی کا سوال تھا کیوں کہ احد وغیرہ کے تجربات سامنے تھے مگر اس وقت اس شخص کی حیثیت جو موضوع کلام ہے۔

(فروع کافی جلد ا مطبوعہ طہران ص ۳۶۵)

اس سے حضرت امیرؑ کے کردار کی بھی پوری شرح ہو جاتی ہے جس کے بعد کچھ روشنی ڈالنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

چھٹی بات

کہا جاتا ہے کہ ایران کے شہنشاہ یزدجرد کی بیٹی جناب شہربانو عہد خلیفہ دوم میں گرفتار ہو کر آئی تھیں جنھیں خلیفہ دوم نے حضرت علیؑ کے صاحب زادے حضرت امام حسینؑ کے سپرد فرمایا یہ اس کا واضح ثبوت ہے کہ ان بزرگوں کے باہمی تعلقات بے حد خوش گوار تھے۔

حالانکہ اس کی اصل بنیاد یعنی اس واقعہ کا عہد عمر میں ہونا ہی مسلم نہیں ہے بلکہ دوسری روایت جو درایۃً صحیح معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ یہ خود حضرت علیؑ کے عہد کا واقعہ ہے۔ اس کے علاوہ جس روایت میں عہد حضرت عمر میں اس واقعہ کا ہونا مذکور ہے اس میں ہے کہ خود جناب شہر بانو نے حضرت امام حسینؑ کو منتخب کیا اور اصولی اختلافات کے باوجود یہ تو مسلم ہے کہ حضرت علیؑ اکثر اس دور میں مفاد اسلام کے پیش نظر مشورے دیا کرتے تھے چنانچہ یہ امر کہ شہر بانو کو باختیار خود شوہر منتخب کرنے کی اجازت دی جائے حضرت امیرؑ کے مشورے سے پہلے ہی طے پا چکا تھا۔ یہ مشورے باہمی تعلقات کی بالکلیہ خوش گواری کی دلیل نہیں ہیں۔ اس پر ابھی نیز روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ والسلام

[ماخوذ از پیام عمل لاہور، محرم نمبر ۱۳۷۹ھ / جولائی ۱۹۵۹ء]

(۳) توحید اور امام حسینؑ

کارنامۂ حسینی یعنی مجاہدۂ کربلا کا اصل سرچشمہ وہی کلمۂ توحید ہے جس کی اشاعت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مکہ میں جسم مبارک پر پتھر کھائے اور اس کے تقاضوں کی تعمیل میں ان کے فرزند حسینؑ نے کربلا میں جسم اقدس پر تلواریں کھائیں۔

یہ لا الٰہ الا اللہ فقط ایک ورد اور وظیفہ تھوڑی تھا جو مسلمانوں کو سکھایا گیا ہو کہ وہ زبان پر جاری کرلیں اور بس۔ بلکہ اس کے معانی یہ تھے کہ اللہ کے مقابلے میں کسی دوسرے اقتدار کے قائل نہ ہو۔ اس کے مقابلے میں کسی دوسرے کے سامنے سر نہ جھکاؤ اور اس کے قانون پر عمل کرکے معاہدے کے بعد جواز روئے فطرت بھی تم پر عائد تھا اور اب اقرار اسلام کے بعد اس نے رسمی شکل بھی

اختیار کرلی ہے، اب کسی دوسرے کو غیر مشروط اطاعت کا عہد و پیمان جس کا نام ''بیعت'' ہے نہ کرو۔ کسی خطا کار کا کسی اللہ کے بندے سے بیعت یعنی غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ اس عہد و پیمان کی نفی ہے جو خالق کی جانب بر بنائے توحید عائد ہوتا ہے اور جس کی تعمیل ہر مسلمان یعنی ہر سچے انسان کا لازمی فریضہ ہے۔

وہ توحید ہی کا ایک تقاضہ ہے جس کے تحت یہ اصول قائم ہوا ہے۔ لاطاعة للمخلوق فی معصیة الخالق۔ یعنی خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے یہاں تک کہ قرآن مجید میں پیغمبرؐ خدا کی اطاعت کا بھی حکم دیا اور کہہ دیا گیا کہ ''من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ یعنی جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ یعنی مرکز اطاعت در حقیقت ایک ہی ہے۔ یہ تمہیں تصور نہ ہونا چاہئے کہ ہم اللہ کے علاوہ کسی اور کی اطاعت کر رہے ہیں اور اسی سے مسلمانوں کو سمجھنا چاہئے کہ وہ اولی الامر بھی جن کی اطاعت بعد رسولؐ فرض قرار دی گئی ہے ایسے ہی افراد ہو سکتے ہیں جن کا کوئی حکم خالق کے حکم سے کبھی متصادم نہ ہوتا ہو بلکہ جن کا ارادہ و مشیت بھی ہمیشہ مشیتِ خالق کا پابند رہتا ہو۔ اس لئے ان کی اطاعت اطاعتِ خالق سے الگ نہ ہو۔

اس بنا پر حضرت امام حسینؑ کے سامنے یزید کی بیعت کا سوال پیش، یہ فقط کوئی سیاسی مسئلہ نہ تھا بلکہ یہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم توحید کی روشنی میں اسلام اور نفی اسلام کا سوال تھا۔ حقیقت میں یہ ایک یزید نہ تھا جو امام حسینؑ سے طلبگار بیعت ہو، بلکہ حضرت کے مقابل میں نمرود اور فرعون اور پھر ابوجہل و ابوسفیان وغیرہ سب کی روحیں تھیں جو یزید کے پیکر میں بیعت یعنی غیر مشروط اطاعت کے عہد و پیمان کی طلبگار تھیں اور حسینؑ ابن علیؑ، ابراہیمؑ و موسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نمائندہ ہوتے ہوئے غیر اللہ کی اس اطاعت سے انکار کر دینا اپنا فرضِ عین سمجھتے تھے، جس فرض کو انہوں نے ناقابلِ تصور مشکلات کے باوجود پورا کیا، اور اس طرح توحیدِ الٰہی کے اس پرچم کو بلند رکھا جسے ان کے جد بزرگوار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اونچا کیا تھا اور جس کے ان کے آباواجداد اور اب یہ خود محافظ تھے۔

ماخوذ از شہید اعظم نمبر سالانہ میگزین پیغام منشورۂ انجمن ہاشمی جائس، ۱۹۸۴ء ص، ۹

(۴) خلافت یزید کی خشت اول

ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے اپنی تاریخ الامم و الملوك'' میں جو تاریخ طبری کے نام سے مشہور ہے۔ ۵۶ھ کے حوادث میں لکھا ہے: وفیھا ومآ معاویة الناس الیٰ بیعته ابنه یزید ومن بعد ولا وجعله ولی العهد۔ اس سال معاویہ نے لوگوں کو اپنے فرزند یزید کی بیعت کی طرف دعوت دی اور اسے اپنا ولی عہد بنایا۔

پھر عنوان قائم کیا ہے، ذكر السبب فی ذالك، اس کا سبب کیا ہوا تھا؟ اس ذیل میں وہ کہتے ہیں: حدثنی الحارث قال حدثنا علی بن محمد قال حدثنا ابو اسمٰعیل الهمدانی وعلی بن مجاهد، قال قال الشعبی قدم انعیرة علی معاویة واستعفاه وشكا الیه الضعف فاعفاه وراد ان یولی سعید بن العاص وبلغ كاتب لمغیرة ذالك فاتی سعید بن العاص فاخبره وعنده رجل من اهل الكوفة یقال وبیعة او الربیع من خزاعة فاتی المغیرة فقال یا مغیرة ماارئ امیر المومنین الا قد قلاك رایت ابن خنیس كاتبك عند سعید بن العاص یخبره ان امیر المومنین۔ ان الكوفة قال المغیرة افلا یقول کما قال۔

ام غاب ربك فاعترتك خصاصة ولعل وبك ان یعود موید ا رویدا ادخل علیٰ یزید فدخل علیه فعوض له بالبیعت فاد ذالك یزید الی ابیه فرد معاویة المغیرة الی الكوفة فامرهٔ بعمل فی بیعته

يزيد تشخص المغيرة الى الكوفةفاتاه كاتبه ابن خنيس فقال والله ماغششتك وخنتك ولا كرهت ولا يتك ولكن سعيد كانت له عندي يد ويلاءٍ فشكرت ولك له فرضي عنه واعاده الى كتابته وعمل المغيرة في بيعة يزيد وانه ذالك وفداً الیٰ معاوية۔

مغیرہ بن شعبہ کی شخصیت تاریخ اسلام میں کوئی اجنبیت نہیں رکھتی۔ احکام شرعیہ کی پابندی سے جوان کی بے نیازی تھی وہ زمانہ خلیفہ دوم میں ان الزامات سے ظاہر ہے جوان پر قائم کئے گئے تھے۔ وہ تو کہئے کہ چار میں سے ایک گواہ خود حاکم کے اشارہ سے متزلزل ہوگیا، ورنہ وہ سنگسار کئے جاچکے ہوتے اور خلافت یزید کی داغ بیل ڈالنے کے لئے زندہ نہ ہوتے۔ اس کے ساتھ سیاستدانی میں ان کی شخصیت مسلم ہے۔ کہاجاتا ہے کہ اس زمانہ میں دھاۃ العرب یعنی کامل سیاستداں عرب کے چار تھے: ایک امیر شام معاویہ بن ابی سفیان، دوسرے عمر بن العاص، تیسرے مغیرہ بن شعبہ یہ تینوں ایک طرف تھے اور چوتھے قیس بن سعد بن عبادہ انصاری یہ ایک حضرت علیؑ بن ابی طالب کی طرف تھے۔

مغیرہ بن شعبہ معاویہ کی طرف سے کوفہ کے حاکم تھے۔ طبری کا بیان ہے کہ مجھ سے حارث نے بیان کیا ان سے علی بن محمد نے ان سے ابواسمٰعیل ہمدانی اور علی بن مجاہد نے اور ان دونوں سے شعبی نے بیان کیا کہ مغیرہ معاویہ کے پاس آئے اور ضعف پیری کا عذر کرتے ہوئے حکومت سے معافی طلب کی۔

صورت واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ استغاثہ حقیقتاً نمائشی طور پر ایک سیاسی نازکی کی حیثیت رکھتا تھا جیسے اکثر قومی لیڈران اداروں سے کہ جن میں ان کا اقتدار ہوتا ہے کبھی کبھی صرف اس لئے استعفیٰ دے دیا کرتے ہیں کہ ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوجائے۔ مغیرہ کا اندازہ بظاہر یہ تھا کہ امیر معاویہ ان کے استعفے کو سنتے ہی پریشان ہوجائیں گے اور خوشامد کرنے لگیں گے کہ آپ اپنا استعفیٰ واپس لے لیجئے اور حکومت کوفہ کو ترک نہ کیجئے مگر یہاں معاملہ الٹا ہوگیا۔ امیر شام جیسے پہلے سے منتظر تھے اور موقع ڈھونڈھ رہے تھے۔ انہوں نے ان کا استعفیٰ فوراً منظور کرلیا اور ارادہ کیا کہ سعید بن عاص کو حاکم کوفہ بنادیں۔ ظاہر ہے کہ جب شہنشاہ وقت کی نظر کسی سے برگشتہ ہوجائے تو پھر اس کے دست و بازو بھی اس کے ساتھ وفاداری پر قائم نہیں رہتے۔ چنانچہ یہ آثار ظاہر ہونا تھے کہ مغیرہ کے مخصوصین کا بھی رنگ بدل گیا یہاں تک کہ ان کا خاص کاتب ابن خنیس سعید بن عاص کے پاس مبارک باد دینے کے لئے گیا۔ اس وقت وہاں اہل کوفہ میں سے ربیعہ یا ربیع نامی قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص موجود تھا۔ وہ مغیرہ کے پاس آیا اور کہا مجھے ایسا معلوم ہوا ہے کہ خلیفہ اسلام آپ سے ناراض ہوگئے ہیں۔ کیونکہ میں نے آپ کے کاتب ابن خنیس کو سعید بن عاص کے پاس دیکھا ہے۔ وہ انہیں خوشخبری دے رہا تھا کہ خلیفہ نے انہیں کوفہ کا حاکم قرار دیا ہے۔ پس یہ سننا تھا کہ مغیرہ کو اپنے اقتدار کے قائم رکھنے کی فکر ہوئی اور اس کے لئے وہ پہلے سے اپنے ذہن میں منصوبہ بنا چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے تو ایک شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ خدا مالک ہے شاید وہ اس کے بعد اپنی تائید شامل حال کردے۔ اور پھر کہا کہ ٹھہرو ذرا مجھ کو یزید کے پاس ہو آنے دو۔ اس کے بعد وہ یزید کے پاس گئے اور وہاں جاکر معاویہ کی ولیعہدی کے سبز باغ دکھائے یزید نے اس کا ذکر اپنے باپ سے کیا۔ اور کہا کہ مغیرہ اس مہم کی کامیابی کا ذمہ لے رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ معاویہ نے مغیرہ کو کوفہ کی حکومت پر واپس کردیا اور انہیں یزید کی بیعت کے لئے فضا کو سازگار بنانے کا کام سپرد کیا اور مغیرہ کوفہ کی طرف واپس آگئے۔ مغیرہ کے کاتب نے آکر معافی مانگی اور قسمیں کھاکر کہا کہ مجھے آپ کی بدخواہی منظور نہ تھی اور نہ میں نے آپ کی خیانت کی۔ نہ میں آپ کی حکومت کو ناپسند کرتا ہوں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سعید بن عاص کا مجھ پر پہلے سے ایک احسان ہے۔ میں نے ان کے اظہار تشکر کے طور پر یہ خوشخبری ان تک پہنچائی تھی۔ مغیرہ اس سے خوش ہوگئے۔ اسے کاتب کے عہدے پر بحال کردیا۔ اور پھر یزید کی بیعت

کے لئے کام کرنا شروع کر دیا۔ اور اس بارے میں معاویہ کے پاس ایک وفد روانہ کیا۔

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ یزید کی ولیعہدی کی ابتدائی تحریک مفاد دینی کے ساتھ کسی مفاد ملکی کے لحاظ سے بھی نہ تھی بلکہ صرف ایک شخص کی طرف سے اپنے ذاتی مفاد کے لئے ایک چال کے طور پر اس کا آغاز ہوا جس کے نتائج کی لپیٹ میں قیامت تک کے لئے تمام امت اسلامیہ کو آجانا پڑا۔ اسی بنا پر حسن بصری کا قول تھا جسے حافظ جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کا معاملہ دو آدمیوں نے خراب کیا ایک عمرو بن العاص جب اس نے معاویہ کو قرآن نیزوں پر بلند کرنے کا مشورہ دیا اور دوسرے مغیرہ بن شعبہ۔

(تاریخ الخلفاء مطبوعہ لاہور صفحہ ۱۳۹)

[ماخوذ از پیام اسلام لکھنؤ، محرم نمبر ۷۹ ۱۳ھ/جولائی ۱۹۵۹ء]

(۵) ترجمان القرآن
جناب عبداللہ بن عباسؓ

اصحاب امیر المومنینؑ میں ان کی شخصیت گوناگوں حیثیتوں سے بہت اہم ہے اور جناب امیر المومنینؑ سے آپ کے اخلاص ومحبت کے احادیث کو درایتی حیثیت سے بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ جتنے گہرے حجابات کے باوجود حقیقت نمایاں ہوجائے اس کے پر قوت ہونے کی قوی ترین دلیل ہے۔

ایک طرف بنی امیہ اور ان کے ہواخواہوں کی یہ پالیسی کہ اہلبیتؑ رسولؐ کے خلاف جو بات بھی لکھنا ہو وہ ان کے کسی عزیز کی طرف نسبت دے کر کہی جائے، اسی لئے جناب عباس کی زبانی اس قسم کی باتیں تصنیف کی گئیں جو امیر المومنینؑ کی حقانیت کے خلاف بطور ثبوت پیش کی جاسکتیں، اور اس پر جناب عبداللہ ابن عباس کی طرف اس قسم کے حکایات منسوب کئے گئے، جو اس بات کا پتہ دیں کہ انہیں جناب امیرؑ کے طرز عمل سے اتفاق نہ تھا۔

یہ کام ڈیڑھ دوسو برس تک بنی امیہ کے زیر سرپرستی ہوتا رہا اور اس کے بعد برسر اقتدار، ان ہی جناب عبداللہ ابن عباس کی طرف نسبی حیثیت سے نسبت رکھنے والے بنی عباس برسر اقتدار آئے جنہوں نے اگرچہ سلطنت آل محمدؐ کے نام پر اور ان کے ساتھ خلق خدا کی ہمدردی کی بدولت حاصل کی تھی، مگر بعد میں انہیں بھی اسے اقتدار ملکی کے تحفظ کے لئے ضرورت اس کی محسوس ہوئی کہ آل رسولؐ کو نذر تغافل کیا جائے اور وہ اپنے کو زیادہ حقدار وراثت رسولؐ ثابت کریں۔ اس لئے ان کا نصب العین حتی الامکان یہ تھا کہ بنی عباس کی فوقیت ثابت ہو اور لوگ علیؑ واولاد علیؑ کو بھول جائیں۔ اس عناد کی حد متوکل کے دور میں تو اس منزل تک پہنچی کہ بھرے ہوئے دربار میں حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی نقل بنائی جاتی تھی اور بادشاہ و ارکان سلطنت قہقہے لگاتے تھے۔

اس صورت میں عباسی سلطنت کی پالیسی کا کہاں تقاضا تھا کہ جناب عبداللہ ابن عباس کے اس اخلاص وارادت کے روایات جو انہیں حضرت امیر المومنینؑ علی ابن ابی طالبؑ سے تھا یا آپ سے ان کے کسب فیوض کے اعترافات منظر عام پر آسکیں مگر اس سب کے بعد یہ حقانیت کی طاقت سمجھنا چاہئے کہ جناب عبداللہ بن عباس کی حضرت امیر المومنینؑ علی ابن ابی طالبؑ کے ساتھ انتہائی وابستگی اور علمی وعملی طور پر آپ کے زیر سایہ تربیت پانا، تاریخ اور رجال وسیر کی ایسی ناقابل انکار حقیقت ہے، جس کے شواہد کسی زیادہ جستجو کے محتاج نہیں بلکہ معمولی سے ذوق مطالعہ رکھنے والے کو بھی کسی شاذ ونادر کتاب میں نہیں بلکہ متداول علمی وتاریخی ماخذوں میں نمایاں نظر رہیں گے۔

ولادت

جناب عبداللہ ابن عباسؓ ہجرت کے تین سال پہلے پیدا ہوئے اور اس لئے وفات پیغمبر خداؐ کے وقت آپ کی عمر تیرہ برس کی ہوتی ہے۔ ایک روایت میں اس سے کم یعنی دس برس اور ایک میں اس سے زیادہ یعنی پندرہ برس بھی وارد ہے مگر پہلا قول زیادہ ترصحیح ہے۔

عرب میں تیرہ برس کی عمر کا بچہ جوانی کی منزل سے قریب

ہوتا تھا اس لئے جناب رسالتمآبؐ کے اقوال وافعال کے متعلق ان کے جو روایات یا تاثرات ہوں، انہیں بے وقعت نہیں سمجھا جا سکتا۔ **استیعاب** علامہ ابن عبدالبر اور **اصابہ** حافظ ابن حجر وغیرہ میں یہ بھی وارد ہے کہ آپ کی ولادت کے بعد کمسنی ہی میں دو مرتبہ حضرت پیغمبر خداؐ نے ان کے لئے علم وحکمت کے عطا ہونے کی دعا فرمائی، جس کے الفاظ چاہے مختلف ہوں مگر مفہوم تقریباً ایک ہے۔ مثلاً کہیں یہ ہے **اللهم علّمه الحكمة وتاويل القرآن** (پروردگار اسے حکمت اور تاویل قرآن کا علم عطا فرما) کہیں ہے **اللهم فقّهه فى الدين وعلمه التّاويل** پروردگار اسے فہم دین اور علم تاویل عنایت فرما۔ **اللّٰهم زدهٔ علما وفقها** پروردگار اس کے علم وفقاہت میں اضافہ کرنا)

پیغمبر اسلامؐ کی یہ حدیثیں خود باب مدینۃ العلم اور باب دارالحکمہ سے ان کے ہمیشہ وابستہ رہنے کی ضمانت تھیں، اس لئے کہ اصل علم وحکمت وہی ہے، جو اصلی سرچشمہ علم وحکمت سے حاصل ہو۔

ابتدائی تاثرات

اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ پیغمبر خداؐ کے بعد جب سیاست کی ہوا نے اکثریت کو دوسرے رخ پر منتشر کر دیا تو جناب عبداللہ ابن عباس، باوجود کم عمری کے پختہ کاری کے ساتھ اسی حقیقت سے وابستہ رہے جو ان کی صحیح معرفت کا تقاضا ہو سکتی تھی۔

وفات رسالتمآبؐ کے قبل ہی سے جو ناگوار واقعات سامنے آرہے تھے ان پر جناب عبداللہ ابن عباس ایک ذہین صاحب نظر مکمل انسان کی طرح غور کر رہے تھے اور اس سے شدید طور پر متاثر تھے، چنانچہ صحاح ستہ کی سب سے اہم کتاب صحیح بخاری، (مطبوعہ کرزن پریس، دہلی، نصف دوم، صفحہ ۸۴۸/)

"**بنی باب الیقول المریض قوموا عنی**" میں ہے کہ حضرت عباس نے کہا کہ جب رسالتمآبؐ کے احتضار کا عالم تھا اور اس وقت گھر میں بہت سے لوگ تھے جن میں عمر ابن الخطاب بھی تھے تو حضرت نے فرمایا کہ آؤ میں تم کو ایک تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے جناب عمر نے کہا کہ رسالتمآبؐ پر اس وقت مرض کا غلبہ ہے، قرآن تمہارے پاس موجود ہے، اور ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے، گھر والوں میں اس وقت اختلاف ہوا، کچھ لوگ کہتے تھے کہ قلم دوات دینا چاہئے تا کہ رسالتمآب ایسی تحریر لکھ دیں، جس کے بعد گمراہی سے محفوظ ہو جاؤ اور کچھ لوگ وہی کہتے تھے جو عمر نے کہا تھا جب شور ہوا اور جھگڑا ہونے لگا تو رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ میرے پاس سے اٹھ جاؤ۔ اس کے بعد بخاری میں ہے **فكان ابن عباس لقول ان الرزيّة كل الرزية لما حال بين رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم بين ان يكتبه لهم ذلك الكتاب من اختلافهم و لفظهم** یعنی ابن عباس کہتے ہیں کہ مصیبت سب سے بڑی وہی تھی کہ رسالتمآبؐ کو وہ تحریر لکھنے کا موقع نہ دیا گیا، جو آپ لکھنا چاہتے تھے۔

یہ ایک معمولی بچہ کی بات نہیں ہے بلکہ ایک پوری سیاست اسلام کا تجزیہ کرنے والی نظر جائزہ ہے، جس نے اصل سنگ بنیاد کو دریافت کر لیا، جس پر بعد کے صدیوں کی سیاست کی عمارت قائم ہوئی۔

پیغمبرؐ خدا کے بعد آپ نے اپنے علمی استفادہ کا مرکز حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی قرار دیا اور باوجود اپنی کم عمری کے وہ امتیاز حاصل کیا کہ علامہ ابن عبدالبر کے الفاظ **استیعاب** میں یہ ہیں **لقد كان عمر بعده للمقصدات** یعنی عبداللہ ابن عباس کو حضرت عمر علمی مشکلات کے حل کرنے کے لئے ذخیرہ رکھتے تھے۔ علامہ ابن حجر مکی مصنف **صواعق محرقہ** نے بھی **منہج مکیہ شرح قصیدہ ھمزیّہ** میں لکھا ہے کہ **تقديم عمر لابن عباس علىٰ اكابر مشيخة المهاجرين والانصار لانه كان يجد عنده من العلم ببركة النبى بان الله يفقهم فى الدين ويعلمهم التاويل ماليس عندهم** منہج مکیہ مطبوعہ مصر ۱۳۰۷ھ، ص ۲۲۷ وص ۲۲۸) یعنی حضرت عمر ابن عباس کو اکابر شیوخ مہاجرین وانصار پر ترجیح دیتے تھے، اس لئے کہ ان کے پاس دعائے رسولؐ کی برکت سے وہ علم پاتے

تھے جوان کے پاس نہ پاتے تھے۔

تبحر علمی

حضرت عمر کے علاوہ دوسرے صحابہ بھی ان کی بلندی علمی کے معترف تھے۔ جناب عبداللہ ابن مسعود کا قول ہے نعم ترجمان القرآن ابن عباس لو ادرك اننا ماعاشره منا رجل۔ (کیا کہنا ترجمان القرآن ابن عباس کا اگر ہماری عمر کے ہوتے تو ہم میں سے کوئی ان سے بات نہ کرسکتا۔ طاؤس یمانی کا قول ہے کہ میں نے پانچ سو اصحاب رسولؐ ایسے دیکھے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو ابن عباس اس کی غلطی پر تنبیہ کرتے تھے اور اسے اقرار کرنا پڑتا تھا۔

مسروق کا قول ہے کہ جب میں عبداللہ ابن عباس کو دیکھتا تھا تو کہتا تھا اجمل الناس (سب سے زیادہ خوبصورت) اور جب بات کرتے تھے تو کہنا پڑتا تھا ''افصح الناس'' اور جب حدیثیں بیان کرنے پر آتے تھے تو ماننا پڑتا تھا کہ اعلم الناس۔

سید مرتضیٰ زبیدی نے ''شرح احیاء العلوم'' میں لکھا ہے کہ حافظ ابونعیم نے ''حلیۃ الاولیاء'' میں ابوصالح کی روایت درج کی ہے کہ میں نے ابن عباس کی علمی صحبت کا ایسا واقعہ دیکھا ہے کہ جس پر اگر تمام قریش ناز کریں تو بجا ہے۔ میں نے دیکھا کہ دروازے پر اتنے لوگ مختلف مسائل کی تحقیق کرنے والے

سقائے حرم قمر بنی ہاشم

کربلا میں دیکھ تصویر مساواتِ حسینؑ
جو علمبردار لشکر ہے وہی سقہ بھی ہے
کہتا ہے انداز یہ عباسؑ کی انگڑائی کا
عرش ہے اک ہاتھ میں اک ہاتھ میں دنیا بھی ہے

انیس العصر سید ابن الحسین مہدی نظمی اجتہادی

(صفحہ ۳۵ رکا بقیہ۔۔۔عزاداری اور شاہانِ اودھ)

کہ غدر کے بعد نواب اغن صاحب نے جو اس وقت کے روساء میں تھے اپنا تعزیہ ۸ ربیع الاول کو اٹھایا جو اگر چہ جلوس کے ساتھ اٹھتا تھا مگر بہت خاموش اور یہ تعزیہ 'چپ تعزیہ' کے نام سے مشہور ہوا۔

صرف نقیب کوئی دلدوز نوحہ کا مصرعہ بلند آواز میں پڑھتا اور سامعین کے گریہ کا شورا ٹھتا پھر سکوت طاری ہوجاتا۔ یہ تعزیہ چاہ کنکر سے اٹھتا ہے اور کئی ہزار کے مجمع کے ساتھ کاظمین میں دفن کیا جاتا ہے۔ ہزاروں آدمی زیارت کو آتے ہیں۔

بعد انتزاع سلطنت جب واجد علی شاہ ٹمیا برج میں قید کئے گئے، انہوں نے عزاداری کا سلسلہ وہاں بھی شروع کیا۔ ان کا قائم کردہ امام باڑہ آج بھی موجود ہے جہاں بڑی بڑی مجلسیں ہوتیں لکھنؤ کے اعلیٰ پائے کے ذاکرین مجالس میں ذاکری کرتے تھے۔ بہر حال یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ آج جس اہتمام سے عزاداری کرتے ہیں اور جو انہماک اور شغف امام مظلومؑ کی عزا کے سلسلہ میں نظر آتا ہے یہ سب شاہان اودھ کی دین ہے ورنہ ممکن تھا کہ عزاداری اس منظم طریقہ پر کرنے کے ہم لوگ اہل نہ ہوتے۔

مآخذ

- تاریخ اودھ و دیگر کتب
- سفرنامہ پادری ہبر صاحب
- عادات واطوار مسلمان ہند
- تفضیح الغافلین
- سفرنامۂ ڈاکٹر بلبن
- فسانۂ عجائب و دیگر کتب

(اشاعت اول: مجلہ سرفراز لکھنؤ، محرم نمبر ۱۳۸۷ھ)
اشاعت ثانیہ امامیہ مشن، لکھنؤ نمبر ۵۲۴ رمحرم ۱۳۸۸ھ

جمع ہو گئے کہ راستہ بند ہو گیا۔ نہ ادھر کا کوئی آدمی ادھر جا سکتا، اور نہ ادھر کا کوئی ادھر آ سکتا۔ میں اندر گیا اور میں نے ابن عباس کو اطلاع دی کہ اتنے لوگوں کا مجمع ہے۔ انہوں نے وضو کیا اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھے، کہا کہ باہر جاؤ اور کہو کہ جو لوگ الفاظ قرآن اور اس کے حروف کے متعلق سوال کرنا چاہتے ہیں، وہ اندر آئیں۔ میں گیا اور میں نے ان لوگوں کو اندر آنے کی اجازت دی۔

وہ لوگ آئے یہاں تک کہ تمام گھر بھر گیا، انہوں نے اپنے اپنے مسئلہ دریافت کئے اور ابن عباس نے جو کچھ انہوں نے پوچھا وہ بتایا اور کچھ اپنی طرف سے اضافہ کر دیا۔ پھر انہوں نے کہا کہ بس اب اپنے دوسرے بھائیوں کو موقع دو، وہ لوگ اٹھے اور باہر گئے۔ ابن عباس نے مجھ سے کہا کہ جاؤ اور کہو کہ جو لوگ تفسیر قرآن اور تاویل کے متعلق سوال کرنا چاہتے ہیں وہ اندر آئیں۔ روایت طولانی ہے جس میں اسی طرح مختلف علوم وفنون کے طلاب کے جمع ہونے اور اپنے سوالات سے کچھ زیادہ ہی معلومات حاصل کرنے کا تذکرہ ہے۔

جناب ابن عباس کے اعترافات

باوجود اس مقبولیت اور مرجعیت کے جناب عبداللہ ابن عباس اظہار حق اور اعتراف حقیقت سے کبھی خاموش نہیں ہوئے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا، باوجودیکہ خلیفہ دوم آپ کی بڑی قدر ومنزلت کرتے تھے، مگر مسئلہ خلافت پر آپ کی ان سے اکثر تلخ اور سخت گفتگوئیں ہوئی ہیں، جن کی تفصیل طول کے خیال سے ترک کی جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ آپ کا امیرالمومنینؑ سے تفسیر سورہ حمد دریافت کرنا اور امیرالمومنینؑ کا رات بھر بیان فرمانا اور آخر میں یہ ارشاد کہ **لو زادنی اللیل لزدناک** (اگر رات اور گنجائش دیتی تو میں اور بیان کرتا) اس موقع پر جناب ابن عباس کا قول ہے کہ **کنت ان نفسی فی جنبہ کاالفوارۃ فی جنب البحر المشتبحر** (میں اپنے کو آپ کے پہلو میں ایسا پار پاتا تھا جیسے فوارہ ایک بڑے سمندر کے پہلو میں)۔

مجاہدات

حضرت امیرالمومنینؑ کو اپنے زمانہ خلافت میں جو جمل وصفین ونہراوان میں جہاد کرنا پڑے ان میں بھی جناب عبداللہ ابن عباس پیش پیش نظر آتے ہیں۔ چنانچہ **استیعاب** میں ہے۔ (برحاشیہ اصابہ جلد ۲، ص ۳۵۷) کہ **شہید عبداللہ ابن عباس مع علی الجمل وصفین والنہروان۔**

حضرت امیرالمومنینؑ کی شہادت کے بعد اقتدار بنی امیہ کے زمانہ میں وہ حکومت وقت کے خلاف جہاد باللسان میں مشغول رہے۔ چنانچہ کمال الدین دمیری نے حیات الحیوان (مطبوعہ مصر جلد ۱، ص ۱۴۵ میں شفاء الصدو) ابن سبع بستی کے حوالہ سے جناب علی ابن عبداللہ ابن عباس کی روایت لکھی ہے کہ ایک مرتبہ اپنے والد کے ساتھ مکہ معظمہ میں اس وقت، جب کہ ان کی آنکھوں کی بصارت زائل ہو چکی تھی ہمارا گذر ہوا ایک جماعت کی طرف سے جو زمزم کے کنارہ بیٹھی ہوئی علی ابن ابی طالبؑ کو برا کہہ رہی تھی، جناب عبداللہ ابن عباس نے اپنے شاگرد سعید ابن جبیر سے، جو آپ کا ہاتھ پکڑ کر لے جاتے تھے کہا کہ ذرا مجھے ان کی طرف واپس کرو، سعید انھیں پلٹا کر اس مجمع کے پاس لائے۔

ابن عباس نے کہا **ایکم الساب اللہ ولرسولہ** (تم میں سے کون شخص خدا اور رسولؐ کو گالیاں دے رہا تھا) ان لوگوں نے کہا سبحان اللہ ہم میں سے کوئی شخص نہیں جس نے خدا اور رسولؐ کو برا کہا ہو۔ ابن عباس نے کہا **ایّکم الساب لعلّی** (تم میں سے حضرت علیؑ کو برا کہنے والا کون ہے) ان لوگوں نے کہا کہ ہاں یہ تو یہاں ہو رہا تھا۔ ابن عباس نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسالتمآبؐ کو فرماتے سنا ہے **من سب علیاً فقد سبنی ومن سبنی فقد سب اللہ ومن سب اللہ علی منحزیہ فی النار** ۔ (جو شخص علیؑ کو برا کہے اس نے مجھے برا کہا اور جس نے مجھے برا کہا اس نے خدا کو برا کہا اور جس نے خدا کو برا کہا خدا اس کو اوندھے منہ آگ میں ڈال دے گا۔

فقہی مسلک

مسلمہ طور پر جناب عبداللہ ابن عباس فقہ کے اختلافی مسائل میں ہمیشہ مسلک اہلبیتؑ کی ترجمانی اور استدلالی طور پر اسی کے حق میں جہاد کرتے رہے۔ چنانچہ مسئلہ متعہ میں جناب خلیفہ دوم کے وقت سے لے کر عبداللہ ابن زبیر کے عہد تک ہر ایک برسر اقتدار فرد سے ان کا تصادم ہوتا رہا اور عبداللہ ابن زبیر سے تو انہوں نے بھرے ہوئے مجمع میں بڑی سخت بات کہہ دی کہ اپنی والدہ (اسماء بنت حضرت ابوبکر) سے جا کر دریافت کرو کہ خود تمہاری ولادت کس قسم کے نکاح سے ہوئی ہے۔

اسی طرح متعۃ الحج اور میراث کے اختلافی مسائل عول اور تعصیب وغیرہ میں برابر وہ مسلک جمہور کے خلاف اعلان کرتے رہے جو خود کتب جمہور میں درج ہے۔ اس سب کی تفصیل ایک مستقل اور بسیط تصنیف کی طلبگار ہے۔

بیعت یزید سے انحراف

امیر شام کے مسلک سے اختلاف کے وقتاً فوقتاً مظاہرہ کے ساتھ ساتھ جو ابھی صرف اقوال کی صورت سے تھا، ان کو عملی منزل میں بھی آنے کا پھر اس وقت موقع ملا جب یزید کی بحیثیت ولی عہد بیعت لی جارہی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ حضرت امام حسینؑ کے ساتھ ساتھ جن لوگوں نے شروع ہی میں بیعت سے انکار کیا تھا، ان میں جناب عبداللہ ابن عباس بھی تھے، چنانچہ معاویہ نے اپنے وقت آخر جو اظہار حسرت کے الفاظ بطور پیغام یزید سے کہلوائے ہیں ان میں پانچ آدمیوں کا نام لیا تھا کہ ان کی بیعت نہ کرنے کا مجھے افسوس ہے۔ ان میں جناب عبداللہ ابن عباس کا نام بھی تھا۔ اس کے بعد جب حضرت امام حسینؑ کی شہادت ہوگئی تو سطوت یزید سے مرعوب ہو کر عبداللہ ابن عمر اگرچہ یزید کے اقتدار کے سامنے اتنے سپر انداختہ ہوگئے کہ وہ وفاداری حکومت کے بہت بڑے مبلغ بن گئے، اس وقت بھی جناب عبداللہ ابن عباس اپنے مسلک پر قائم رہے اور کبھی یزید کی بیعت نہیں کی۔

جرأت اظہار کا آخری کارنامہ

یزید کی بیعت سے انحراف کے بعد پھر ایک آسان صورت یہ تھی کہ وہ عبداللہ ابن زبیر کے ساتھ ہو جاتے، جو اس وقت یزید سے کم، بنی ہاشم سے اختلاف رکھتے تھے، اور یزید سے برسرپیکار بھی تھے۔ مگر اہلبیتؑ رسولؐ کا چونکہ مسلک یہ تھا کہ کسی اقتدار باطل کی بیعت نہ کی جائے، اس لئے جناب عبداللہ ابن عباس نے عبداللہ ابن زبیر کی بیعت سے بھی انکار کیا۔ اسے مخبروں نے یزید تک پہنچایا تو اسے خواہ غلط فہمی ہوئی ہو یا سیاسی طور پر فائدہ اٹھانا چاہا ہو، اس نے جناب عبداللہ ابن عباس کو حسب ذیل خط لکھا۔ اس کے جواب میں جناب عبداللہ ابن عباس نے یہ تاریخی جواب دیا جو جرأت اظہار حق کا ایک شاہکار ہے اور جناب عبداللہ ابن عباس کے قلم کی ایک مستند دستاویز ہوتے ہوئے کسی بھی عباسی کے اس مزعومات کے قلعہ کو مسمار کرنے والا ہے جو یزید کی صفائی میں قائم کیا جائے۔

یزید کو یہ معلوم ہوا تو اس نے عبداللہ بن عباس کو لکھا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ اس لامذہب (ابن زبیر) نے آپ کو حرم الٰہی میں اپنی بیعت حاصل کرنے کے لئے بلایا تھا مگر آپ نے ہماری وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے اس کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ بس اپنے ابنائے وطن کو اور ان لوگوں کو جو بیرونجات کے آپ کے پاس آمد و رفت رکھتے ہیں، ابن زبیر اور میری نسبت اپنے صحیح خیالات سے برابر آپ مطلع فرماتے رہے ہیں اس لئے کہ ابن زبیر آپ کو اپنی بیعت اور اطاعت میں لینے کے بعد آپ سے باطل کی تمنا اور اپنے گناہوں میں آپ کو شریک کرنے کی آرزو رکھتا تھا مگر آپ نے ہماری بیعت و اطاعت میں داخل رہتے ہوئے وفائے عہد کے حق پورا کیا ہے لہٰذا خدا اس صلہ رحم کی آپ کو جزائے خیر دے اور بہ ہر طور میں بھی آپ کے اس صلہ رحم اور نیک سلوک کو بھولنے والا نہیں ہوں اور جس صلہ و انعام کے آپ مستحق ہیں وہ بہت جلد آپ کے پاس پہنچاؤں گا۔ مکرر یہ کہ آپ آنے جانے والوں کو ابن زبیر کی برائیوں اور اس کی چرب زبانی کے متعلق متنبہ کرتے رہیں کیونکہ عام طور پر لوگ اس کے متعلق آپ کی رائے کو زیادہ وقیع اور معتبر سمجھتے ہیں۔

عبداللہ ابن عباسؓ نے اس خط کا حسب ذیل جواب یزید کو روانہ کیا۔ ''تمہارا خط پہنچا، تم نے جو یہ لکھا ہے کہ میں نے عبداللہ بن زبیر کی بیعت تمہاری وفاداری کے خیال سے نہیں کی، یہ غلط ہے تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں کبھی بھی تمہارا امداح اور ہواخواہ نہیں رہا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس بات کو بھول جاؤں گا کہ تم نے ہی حسینؑ کو قتل کیا ہے اور کیا بنی مطّلب کے ان نوجوانوں کی خاک وخون میں بھری لاشوں کا ہولناک تصور میرے دماغ سے محو ہوجائے گا جن کے کپڑے تک لوٹ لئے گئے تھے اور بے گوروکفن گرم ریگ پر یونہی چھوڑ دی گئیں تھی ۔صرف ہوا کے جھونکوں نے خاک ڈال کر جنکی پردہ داری کا حق ادا کیا اور جانوران صحرائی نے ان کی حفاظت کے فرض کو پورا کیا۔ یہاں تک کہ اللہ نے ایک قوم کے ذریعہ سے ان کے دفن وکفن کا سرانجام کیا۔

ہاں ہاں اے یزید۔ میں نہیں بھول سکتا اور کبھی نہیں یہ کہ تم نے حسینؑ کو حرم خدا اور حرم رسولؐ سے نکلنے پر مجبور کیا اور ابن مرجانہ کو قتل حسینؑ پر مامور کیا۔ میں تو خدا کی ذات سے بہر حال امید رکھتا ہوں کہ وہ منتقم حقیقی بہت جلد تمہارے اعمال کے مطابق سزا دے گا، اور عذاب میں مبتلا فرمائے گا، کیونکہ تم نے اس کے نبیؐ کی عترت کو قتل کیا ہے اور ان کے قتل پر راضی ہوئے اور یہ جو تم نے لکھا ہے کہ تم میرے ساتھ صلۂ رحم برتو گے اور انعام واکرام سے پیش آتے رہو گے تو تم اپنی اس مہربانی اور صلہ رحم کو بس اپنے ہی لئے اٹھا رکھو ہم کو اس کی مطلق ضرورت نہیں ہے اور یہ جو تم نے رکھا ہے کہ میں لوگوں کو تمہاری طرف مائل اور عبداللہ ابن زبیر سے منحرف اور برگشتہ کروں تو اس کے متعلق میں بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے لئے کبھی خیر وبرکت نہ ہو اس لئے کہ تم مجھ سے اپنی نصرت اور حمایت کی امید رکھتے ہو درانحالیکہ تم نے میرے ابن عم کو قتل اور رسولؐ اللہ کے ان اہلبیتؑ کو ذبح کیا ہے کہ جو رشد وہدایت کے چراغ اور تاریک راتوں میں روشن ستارے تھے افسوس کہ ان کو تمہاری فوجوں کی گھنگھور گھٹا نے پوشیدہ کردیا۔ کیوں اے یزید؟ کیا تم نے اپنے نمک خواروں کو اس لئے حرم الٰہی میں نہیں بھیجا تھا کہ حسینؑ کو اسی حرم مقدس میں قتل کردیں اور کیا تم حسینؑ کو برابر ڈراتے دھمکاتے نہیں رہے؟ یہاں تک کہ وہ سفر عراق اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے تم نے ہی سب کچھ کیا اور اس لئے کیا کہ تمہارے دل میں مخالفت خدا اور رسولؐ اور آل رسولؐ کی جن کی شان میں خدا نے آیۂ تطہیر نازل فرمائی جاگزیں ہے۔ اس آیۂ تطہیر کے مصداق آل رسولؐ ہی تھے نہ کہ تمہارے باپ دادا جو جفاکار، طاغی وباغی اور دشمن خدا اور رسولؐ تھے۔ اب ان افعال واعمال کے باوجود بھی کیا تم مجھ سے اپنی ہواخواہی کی امید رکھ سکتے ہو؟ اے یزید، سب سے زیادہ عظیم جسارت تمہاری یہ تھی کہ تم نے رسولؐ کی نواسیوں کو سر برہنہ کیا اور قیدی بنا کر عراق سے شام تک تشہیر کرایا تاکہ لوگوں کے دلوں پر اپنے غلبہ تسلط اور قہاری کا یہ سکہ بیٹھاؤ کہ بظاہر کس طرح ذریت رسولؐ کو مغلوب ومقہور کرنے میں تم کامیاب ہوئے ہو اور پھر اس پر تم نازاں ہو کہ اس طرح تم نے آل رسولؐ سے اپنے ان فاسق وفاجر اور کافر بزرگوں کے خون کا بدلہ لیا ہے کہ جو جنگ بدر میں قتل ہوئے تھے اور جس کا کینہ تمہارے دل میں دبی ہوئی چنگاری کی طرح چھپا ہوا تھا۔

وفات

یزید اور عبداللہ ابن زبیر کی مخالفت کے بعد حضرت عبداللہ ابن عباس چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں آ گئے تھے، مجبوراً آپ کو حرمین شریفین سے ہجرت کرنا پڑی اور طائف میں جاکر سکونت اختیار کرنا پڑی، وہیں حضرت محمد ابن الحنفیہ بھی ابن زبیر کے تشدد سے جناب مختار کی فوجی امداد کی بدولت چھٹکارا پاکر تشریف لے گئے، وہیں ۶۸ھ میں جناب عبداللہ ابن عباس کی وفات ہوئی۔ حضرت محمد ابن الحنفیہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور کہا **الیوم مات ربانی ھذا الامۃ** (آج اس امت کا عالم ربانی دنیا سے اٹھ گیا۔)

[ماخوذ از سرفراز لکھنؤ، اصحاب امیر المومنین نمبر ۱۹۶۰ء ، صفحہ نمبر ۱۶۳]